ماہنامہ انٹرنیشنل
لاہور

اکتوبر
2019

سرپرست اعلیٰ
محی الدین عباسی

وچیف ایڈیٹر
منزہ خان

ایڈیٹر
فضل الرحمٰن کھوکھر

بیک وقت ''انگریزی'' اور ''اردو'' زبان میں لندن سے شائع ہوانے والا جریدہ

بیگم رعنا لیاقت علی خان: کماؤں کی برہمن لڑکی

(خاتون اول، اسلامی جمہوریہ پاکستان)

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED
CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- Company Incorporation / Registered Office Address
- Personal Income Tax Return investigations
- Rental Income Tax Returns
- UK State Pension Entitlement Review
- Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
- UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- Private UK Pension Tracing
- Assets Review for Inheritance Tax
- Appealing - Past years HMRC Penalties
- Preparation / Filing of prior year tax returns
- Duplicate - Payslips / P60s

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 **FAX** +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM **WEB** WWW.SARMADGLOBAL.COM

اس شمارہ میں

04	درس القرآن
05	اداریہ
07	قائداعظم: تدبر اور تدبیر کا حسین امتزاج
11	جب جناح کا بنگلہ گنگا جل سے دھلوایا گیا
12	تقسیم کے وقت ہجرت کا تحریری معاہدہ نہیں ہوا تھا
14	انڈیا کا پہلا بجٹ لیاقت علی خان نے پیش کیا تھا
16	بیگم رعنا لیاقت علی خان: کماؤں کی برہمن لڑکی (خاتون اول، اسلامی جمہوریہ پاکستان)
19	قادیانی مسئلہ اور ٹرمپ
22	شیر سندھ ''میر شیر محمد تالپور''
25	''بلوچستان کے خلائی سائنسدان ڈاکٹر یار جان عبدالصمد کی کہانی''
28	لہور، لہور اے
29	خورشید ہوٹل کے منے میاں سے صادق حلوہ پوڑی کے غلام رسول تک
31	تاریکن وطن
33	پنجاب کے دریا اور شہر
34	آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟ ''R U OK ?''
37	ترقی کے چند اصول
39	کیا آپ نہاتے ہوئے اپنی ٹانگیں دھوتے ہیں؟
40	بہائیت اور اسلام
42	امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
46	محرم تو سب کا ہوتا تھا!
48	اک یہودی کی باتیں
49	رسول ﷺ کی غریب پروری
52	جس دن ماں کی سمجھ آجائے علم آجائے گا
56	مذہبی شدت پسندی
57	شعر و شاعری
59	جرمنی میں ڈاکٹر روتھ فاو کی یاد میں تقریب
61	زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا عالمگیر رواج اور اس کے فوائد

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

ھُوالناصر — خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

بعد از خدا بعشق محمدؐ مخمرم — گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد 2 شمارہ نمبر 10 صفر/ربیع الاوّل 1441 اکتوبر 2019

زیر انتظام : عباسی اکیڈیمی

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان
فضل الرحمٰن کھوکھر

انچارج بزم خواتین
بشریٰ بختیار خان

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

انچارج بزم اطفال
عیشۃ الراضیہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367

عرفان احمد خان (جرمنی)
+49-1711974701

ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-64333112

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887

حاجی میاں محمد وقار یعقوب
(نمائندہ جنوبی پنجاب پاکستان)
+93-300-6912-273

روحان احمد طاہر (پاکستان)

چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤنڈ

website: lahoreinternational.com

اپنی قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے۔

اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

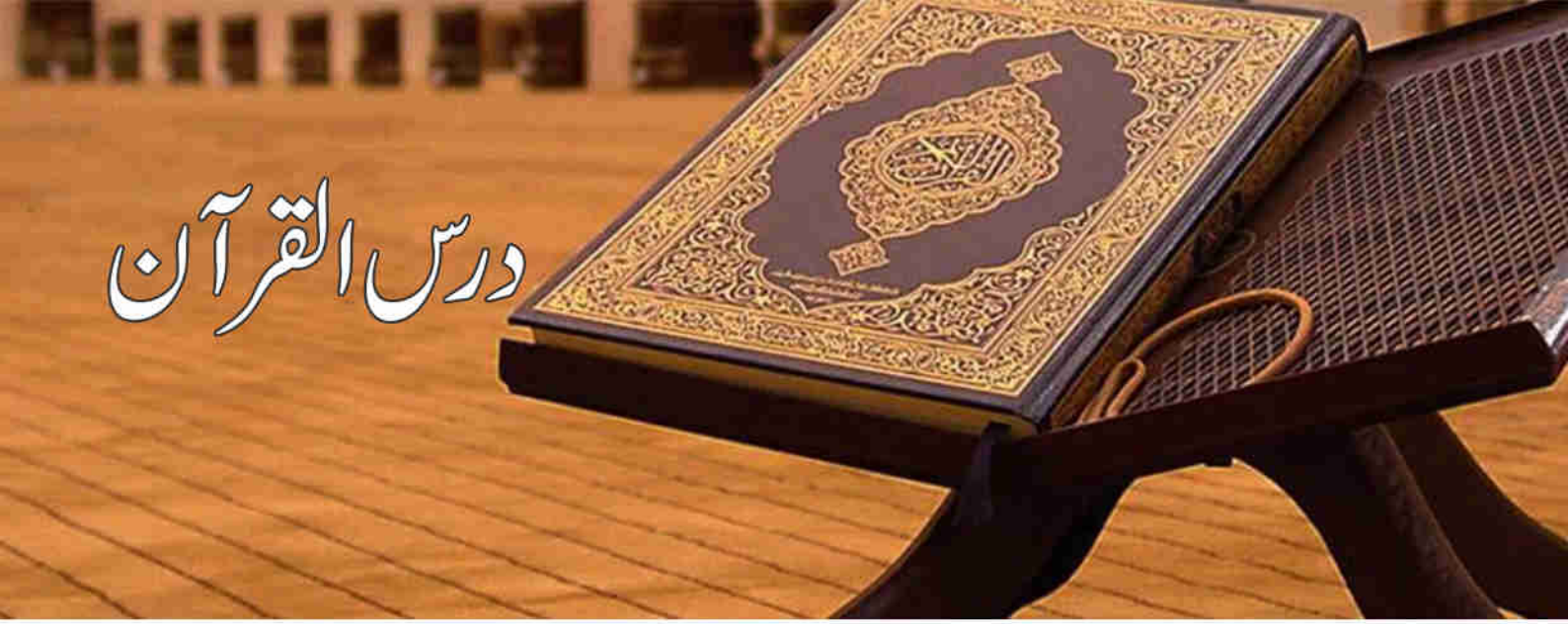

درس القرآن

وَإِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔

(الحجرات:10)

ترجمہ: اور اگر مومنوں میں سے دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرواؤ۔ پس اگر ان میں سے ایک دوسری کے خلاف سرکشی کرے تو جو زیادتی کر رہی ہے اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف لوٹ آئے۔ پس اگر وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل سے صلح کرواؤ اور انصاف کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

تفسیر

آئندہ زمانہ میں مسلمان حکومتوں کے باہمی اختلاف کی صورت میں بہترین طریق کار کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں تو مسلمان حکومتوں کے آپس میں لڑنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس لئے دراصل اس آیت کریمہ میں ایک عظیم الشان چارٹر پیش کیا گیا ہے جو مسلمانوں ہی کے لئے نہیں غیر مسلموں کے لئے بھی قوموں کے اختلاف کی صورت میں ان میں صلح کرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بنیادی خدوخال یہ ہیں کہ:

1. اگر دو مسلمان حکومتیں آپس میں لڑ پڑیں تو باقی مسلمان حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اکٹھے ہو کر دونوں کو لڑائی سے روکیں اور اگر ان میں سے کوئی نصیحت نہ سنے تو فوجی اقدام کے ذریعہ اس کو مجبور کر دیں۔
2. پس جب وہ لڑائی سے باز آجائیں تو پھر ان کے درمیان صلح کروانے کی کوشش کرو۔
3. مگر جب صلح کروانے کی کوشش کرو تو کامل انصاف کے ساتھ کرو اور دونوں فریق کے ساتھ انصاف سے پیش آؤ کیونکہ آخری نتیجہ اس کا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرے ان کو وہ ہرگز ناکام نہیں ہونے دیتا۔

ایک دفعہ پھر متوجہ کیا جاتا ہے کہ اگرچہ یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے مگر جو طریق کار ان کو سمجھایا گیا ہے وہ تمام بنی نوع انسان کے لئے قابل تقلید ہے۔

اس کے بعد مختلف قوموں میں تفرقہ اور انشقاق کی بنیادی وجہ بیان فرمادی گئی جو دراصل نسل پرستی ہے۔ ہر قوم جب دوسری قوم سے تمسخر کرتی ہے تو اپنے آپ کو ان سے گویا الگ اور اعلیٰ نسل شمار کرتے ہوئے ایسا کرتی ہے ۔

اس کے بعد متفرق ایسی معاشرتی خرابیاں بیان فرمادیں جن کے نتیجہ میں افتراق پیدا ہوتے ہیں۔

(اردو ترجمہ اور تفسیر مرزا طاہر احمد اردو ترجمہ قرآن کریم صفحہ 932/929)

حدیث

دو احادیث نبویہ میں غزوہ ہند کا خاص طور پر ذکر آیا ہے۔

1: ہمیں آنحضرت ﷺ نے ہندوستان کی جنگ کی خبر دی ہے اگر مجھے اس میں شامل ہونے کا موقعہ ملا تو میں اپنی جان اور مال اس میں خرچ کر دوں گا۔ پھر اگر میں شہید ہو گیا تو میں بہترین شہیدوں میں شمار ہوں گا۔ اور اگر میں زندہ واپس آ گیا تو میں آزاد ''ابوہریرہ'' ہوگا۔ (سنن نسائی کتاب الجہاد)

2: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ خاص طور پر آگ سے بچائے گا۔ ایک گروہ وہ جو ہندوستان سے جنگ کرے گا اور ایک گروہ جو عیسیٰ بن مریم (مسیح موعود) کے ساتھ ہوگا۔

(سنن نسائی والجامع الصغیر)

اداریہ

مدیر اعلیٰ: محی الدین عباسی

تنازعہ کشمیر واقعات کی روشنی میں

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ہر سال کے سالانہ اجلاس میں پاکستان کا نمائندہ یا وزیر خارجہ ہو یا وزیر اعظم، وہ جموں و کشمیر کے تنازعے کا ذکر اپنے خطاب میں ضرور شامل کرتا ہے۔ عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو وہ مرکزیت حاصل نہیں رہی جو کہ 60 کی دہائی تک رہی تھی۔ اس کے بعد کشمیر کے تنازعے پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل (مجلس امن) یا کسی ذیلی ادارے یا انسانی حقوق کی کونسل میں کوئی مذمتی قرارداد منظور نہیں ہوئی ہے۔ اپوزیشن کی طرف سے یہ سوال ہوا کہ 19 ستمبر 2019ء کو پاکستان نے کشمیر پر قرارداد کیوں جمع نہیں کرائی۔ یاد رہے یہ پہلا واقعہ نہیں ہے اس سے قبل 1994ء میں بے نظیر بھٹو حکومت نے بھی انسانی حقوق کی کونسل میں قرارداد جمع نہیں کرائی تھی۔ لیکن اکثریتی حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے رائے شماری سے قبل ہی قرارداد لے لی گئی تھی۔ اس تنازعے کی وجہ سے دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی کبھی کم کبھی زیادہ رہی ہے۔ اس کشمکش کی وجہ سے دونوں ممالک میں کشمیر ان کی خارجہ پالیسی کا اہم جز رہا ہے۔

1998ء میں بھی کشمیر کا ذکر اقوام متحدہ میں آیا تھا جب سلامتی کونسل میں پاکستان اور بھارت کی ایٹمی دھماکوں پر قرارداد منظور ہوئی تھی۔ قرارداد نمبر 1172 میں دونوں ملکوں سے جوہری سرگرمیوں کو روکنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس وقت سلامتی کونسل کے 5 مستقل ارکان نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تنازعہ کشمیر کو حل کرانے کی کوششیں جاری رکھیں گے۔

لیکن اب تک ایسا نہ ہو سکا پہلے بھی تنازعہ کشمیر چین کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اجلاس میں شامل گفتگو رہا اور آج بھی۔ 1971ء میں بھی تنازعہ کشمیر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ضمناً اٹھایا گیا تھا جب پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ جاری تھی۔ یاد رہے اس تنازعہ کو اقوام متحدہ میں 1948ء میں بھارت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو لے کر گئے تھے۔ جب مبینہ طور پر قبائلیوں کے حملے کے بعد جموں و کشمیر کے مہاراجہ ہر سنگھ نے انڈیا سے الحاق کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہاں جنگ کا رخ اختیار کر کے اس مجلس امن سلامتی کونسل میں چودھری ظفر اللہ خان کے ایک اجلاس میں تقریر کے لئے سوا دو گھنٹے میسر آئے تھے۔ یہاں یہ واقعہ بیان کرنا ضروری ہے کہ 1948ء میں سر محمد ظفر اللہ خان، نواب سر حمید اللہ خان صاحب والی بھوپال کے قانونی مشیر تھے۔ یہاں ان کو ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں اور گراں قدر مشاہر جو پاکستان میں وزراء کے مشاہرے سے 10 گنا سے بھی زیادہ تھا۔ اس اثناء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان اور قائداعظم کا پیغام ملا کہ وہ جلد واپس پاکستان آجائیں۔ آپ کو ایک اہم عہدہ دیا جانا ہے۔ جس پر چودھری ظفر اللہ خان نے نواب آف بھوپال سے اجازت چاہی اور کہا کہ قائد اعظم کی خواہش ہے کہ میں جلد کراچی پہنچوں جس پر نواب صاحب نے یہ کہہ کر اجازت دی کہ پاکستان کی ضرورت اور بہبودی کو میں ترجیح دیتا ہوں لہٰذا نواب صاحب نے اپنے ذاتی پیچ کرافٹ طیارے سے انہیں کراچی روانہ کیا۔

1948ء میں قائداعظم کی خواہش پر انہیں پہلا وزارت خارجہ پاکستان کا قلمدان سپرد کیا گیا۔ اس کے بعد فوری طور پر قائداعظم نے فرمایا کہ برما کے جشن آزادی میں پاکستان کی نمائندگی فرمائیں اور اس کے بعد اقوام متحدہ کی مجلس امن میں قضیہ کشمیر کی پیروی کے لئے چلے جائیں۔ متذکرہ بالا بیان ہو چکا ہے کہ 1948ء میں جواہر لال نہرو اس تنازعہ کشمیر کا معاملہ مجلس امن میں خود لے کر گئے تھے۔ ان دنوں اقوام متحدہ میں برطانوی نمائندہ تو سر الیگزینڈر کیڈوگن تھے لیکن اس قضیئے کی اہمیت کے پیش نظر برطانیہ کے وزیر امور کامن ویلتھ رائٹ آنریبل مسٹر فلپ نوئیل بیکر خود لندن سے برطانیہ کی نمائندگی کے لئے آئے تھے۔ امریکی نمائندہ سینیٹر وارن آسٹن بھے یہ دونوں اصحاب پوری توجہ اور انہماک سے کوشاں تھے کہ مجلس امن کوئی ایسا حل تجویز کرے جس کے نتیجہ میں جلد قضیئے کا پُرامن تصفیہ ممکن ہو جائے۔ لہٰذا دسمبر 1948ء کے آخری ہفتہ میں دونوں حکومتوں نے دونوں قراردادوں کو قبول کر لیا اس پر کمیشن نے دونوں کو دعوت دی کہ اب فیصلہ پر اتفاق ہو گیا ہے تو اب جنگ بند

کردی جائے چنانچہ یکم جنوری 1949ء کو جنگ بند ہوگئی۔

علاوہ ازیں چودھری سر محمد ظفر اللہ خان نے تنازعہ کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں بھرپور انداز میں لڑا اور کشمیر سے متعلق قرارداد پاس کروائی جس کو آج ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کے 23 سال بعد 1971ء تک اقوام متحدہ نے 17 قراردادیں منظور کیں اور ان سے متعلقہ ضمنی معاملات پر اجلاس طلب کئے علاوہ ازیں اقوام متحدہ نے دیگر طریقوں سے بھارت اور پاکستان کے درمیان ثالثی کرانے کی کوششیں بھی کیں۔

1948ء میں تنازعہ کشمیر پر 4 قراردادیں منظور ہوئی تھیں۔ 1950ء میں ایک قرارداد 1952 میں ایک قرارداد 1957ء میں 3 قراردادیں کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل میں منظور ہوئی تھیں ان قراردادوں کے درمیان کئی مشنز تشکیل پائے لیکن کشمیریوں کا مسئلہ ابھی تک حل نہ ہوسکا۔ امریکی صدر ٹرمپ بھی دوبار ثالثی کی پیشکش کر چکے ہیں۔ اس کے بعد 1965ء میں 5 مختلف قراردادیں اور متعلقہ فیصلے منظور ہوئے 1971ء میں دو قراردادیں۔ یہ دونوں ممالک کے درمیان جنگ کے بارے میں تھیں ان دونوں قراردادوں کو سویت یونین نے ویٹو کر دیا تھا جس کی وجہ سے کشمیریوں کی حمایت میں منظور نہ ہوسکی۔ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 307 جس میں کشمیر کا ضمناً ذکر ہے وہ دراصل 1971ء کی جنگ کے آغاز میں منظور ہوئی تھی اور اس وقت کشمیر جنگ کی وجہ نہیں تھا۔ 1972ء میں شملہ معاہدہ طے پانے کے بعد بھارت نے تنازعہ کشمیر کو مستقل طور پر سرد خانہ میں ڈال دیا۔ بظاہر دنیا کی تمام لاتعلقیوں کے باوجود مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کی دستاویزات میں اب بھی ایک حل طلب تنازعہ ہے۔ اکثر کشمیری آزادی کی بات تو کرتے ہیں لیکن انہیں اپنے مسئلہ کے لئے اقوام متحدہ سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ دونوں قراردادیں اقوام متحدہ نے منظور کی ہیں۔

اس ضمن میں اس مسئلہ کا حل اور تجویز بیان کر دیتا ہوں 71 سال قبل پیش کی گئی تھی، چودھری ظفر اللہ خان کی کتاب تحدیث نعمت صفحہ 541 پر اس کا ذکر ہے۔ 1948ء میں اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے دوران قیام میں چودھری محمد علی صاحب کہتے ہیں کہ چودھری ظفر اللہ خان اور میں نے یہ مشورہ کیا کہ ہمیں ہندوستان کے اقدام کی روک تھام کے لئے اپنی فوج کو کشمیر کے محاذ پر بھیج دینا چاہئے اور اس کی اطلاع ہم نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی خدمت میں بھیج دی اور عرض کیا کہ ''کشمیر کا فیصلہ کشمیر میں ہوگا نیویارک میں نہیں ہوگا''۔ وزیر اعظم صاحب جو خود وزیر دفاع بھی تھے اس رپورٹ اور مشورہ پر پاکستانی فوج کو محاذ پر بھیجنے کے احکام صادر فرما دیئے۔ اس بات کا اظہار پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم نے اپنی کئی بار تقریروں میں بھی کیا کہ پاکستان کا وزیر خارجہ مجلس امن سلامتی کونسل کے سامنے تو کہتا ہے کہ ہماری باقاعدہ فوج جنگ میں شامل نہیں لیکن مئی 1948ء میں ثبوت مل گیا کہ پاکستانی فوج جنگ میں حصہ لے رہی ہے۔ راقم الحروف کا تجزیہ بھی یہی ہے اور اس کا یہی حل ہے۔ ''یعنی جنگ'' اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں نے کچھ نہیں کرنا اسلامی ممالک کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور فلسطین کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوسکا۔

کشمیر کی مسلمان آبادی ایک صدی سے زائد عرصہ تک ڈوگرہ مظالم کا شکار رہی اور اس کے بعد بھارتی مظالم کا شکار چلی آرہی ہے۔ خدا تعالیٰ مظلوم کی فریاد کو سنتا ہے اور آخر کار ظالم کی گرفت ہوگی اور مظلوم کی دادرسی اللہ کرے وہ دن جلد آئے۔

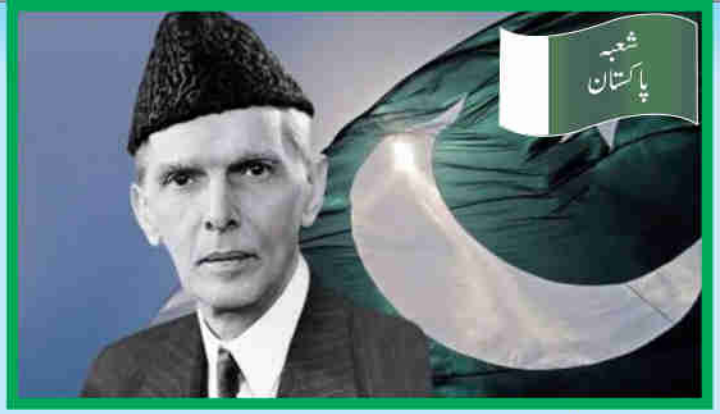

قائدِ اعظم: تدبر اور تدبیر کا حسین امتزاج

تحریر خواجہ رضی حیدر (سابق ڈائریکٹر قائداعظم اکیڈمی)

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح تدبّر اور فراست کا مجسّمہ تھے۔ آپ کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ آپ جو اقدام کرتے اُس پر پہلے اچھی طرح غور و فکر کر لیتے تھے، اس کے بعد اسے عملی صورت دیا کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران متعدد مراحل پر آپ نے فیصلے میں تاخیر کا مظاہرہ کیا جس سے جزوی طور پر مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہوئی، لیکن جب آپ نے فیصلے کا اعلان کیا تو ہر شخص نے آپ کے تدبر اور فراست کی داد دی۔ خصوصاً 1928ء میں نہرو رپورٹ کے موقعے پر آپ کی طویل خاموشی تشویش کا باعث تھی۔ اکتوبر 1928ء میں انگلستان سے واپسی پر جب اخباری نمائندوں نے آپ سے اس رپورٹ پر اظہارِ خیال کے لیے کہا تو آپ نے رپورٹ پر تبصرہ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی مجھے اس رپورٹ کے تفصیلی مطالعے کا وقت نہیں ملا ہے۔ لیکن آپ نے اس موقعے پر مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ پریشان نہ ہوں اور متحد رہیں، کیوں کہ مسائل حل ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ پھر 31 دسمبر 1928ء کو کلکتہ کے مقام پر کُل جماعتی کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے آئینی اور قانونی طور پر نہرو رپورٹ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور واضح طور پر کنونشن سے کہا:

''نہرو رپورٹ کو جناح کی تائید کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تائید کی ضرورت ہے۔ اگر اقلیتوں کا مسئلہ آپ نے آج حل نہیں کیا تو لازماً اسے کل حل کرنا پڑے گا۔ ہندو اور مسلمان اسی ملک کے باشندے ہیں۔ اگر ان کے درمیان باہمی اختلافات ہیں بھی تو ان اختلافات کی وجہ سے دشمنی اور عداوت مول نہ لیجیے۔ اگر وہ باہم اتفاق اور یگانگت پیدا کرنے سے معذور ہیں تو کم از کم اتنا تو کریں کہ دشمنوں کی مانند ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر نہیں بلکہ دوستوں کی طرح آپس میں مصافحہ کر کے جدا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق دیکھنا میری زندگی کی ایک بڑی آرزو ہے۔ اس اتحاد کے راستے میں کسی منطق، نا انصافی اور کسی کشمکش کو حائل نہ ہونے دیجیے''۔

قائداعظم کی اس دردمندانہ اپیل کے باوجود کانگریس کی ہندو قیادت نے قائد اعظم کی ترمیم کو مسترد کرتے ہوئے نہرو رپورٹ کی، جس میں مسلمانوں کے آئینی حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، منظوری دے دی۔

مسلمانوں کے مسائل اور مطالبات کے سلسلے میں ہندو قیادت کا رویہ ہمیشہ ہٹ دھرمی اور نا انصافی پر مبنی رہا جس کی بنا پر مسلمانوں کے ہاں یہ خیال تقویت پکڑتا چلا گیا کہ انہیں اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے ایک علیحدہ مسلم ریاست تشکیل دینا پڑے گی۔ کُل جماعتی کنونشن سے واپسی پر قائداعظم نے اپنے ایک دوست سے فرمایا: ''آج ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا اس طرح جدا ہو رہے ہیں کہ وہ آئندہ کبھی باہم متحد نہیں ہوں گے''۔

قائدِ اعظم: تدبر اور تدبیر کا حسین امتزاج

قائداعظم کا یہ تجزیہ ایک پیشن گوئی ثابت ہوا اور مارچ 1940ء میں مسلمانانِ ہند نے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ نہ صرف پیش کیا بلکہ اس مطالبے کی منظوری کے لیے من حیث القوم خود کو وقف کر دیا۔ قائداعظم نے اپنے تجربے کی روشنی میں ہمیشہ کانگریس کو ایک ہندو جماعت قرار دیا، اور کانگریس بھی برابر اپنے ہندو جماعت ہونے کا ثبوت فراہم کرتی رہی۔ قائداعظم نے اسی مطالعے کی روشنی میں جون 1940ء میں وائسرائے ہند سے واضح طور پر کہا کہ آئندہ جو بھی دستوری خاکہ مرتب کیا جائے اُس میں دو خود مختار آزاد ریاستوں کا اصول شامل کیا جائے''۔

اسی اصول کی بنیاد پر قائداعظم نے مارچ 1946 میں وزیر اعظم برطانیہ کو ایک خط میں لکھا: ''ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام چاہتے ہیں اور یہی ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل ہے''۔

بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح نے حصولِ پاکستان کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کی مرحلہ وار سیاسی تربیت کی۔ اگر ہم آپ کی 1937ء سے 1947ء تک کی سیاسی زندگی کو دیکھیں تو آپ کی تقاریر و بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہوئی نظر آئے گی کہ قائداعظم کے ذہن میں ابتدا ہی سے مسلمانوں کی آخری منزل تھی۔

1934ء میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ متحد ہو جائیں اور کسی حتمی لائحہ عمل کے لیے تیار رہیں۔ فروری 1936ء میں آپ نے لاہور میں ایک تقریر کے دوران مسلمانوں سے کہا: ''میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ سکون اور امن سے رہیں اور میری کوششوں میں مجھ سے تعاون کریں تاکہ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ آپ کی خدمت کر سکوں''۔

1937ء میں آپ نے فرمایا: ''اس وقت پورے ہندوستان میں مسلم یکجہتی کی ضرورت ہے۔ مسلم لیگ قومی اصولوں پر یقین رکھتی ہے اس لیے وہ اجتماعی جدوجہد کے ذریعے مسلم حقوق کا تحفظ چاہتی ہے''۔ فروری 1940ء میں آپ نے اینگلو اورینٹل کالج، دہلی میں ایک تقریر کے دوران فرمایا: ''جب میں یہ محسوس کروں گا کہ مسلمان جدوجہد کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں تو پھر میں ان کو آگے بڑھنے کا حکم دوں گا۔ کسی پر بھی انحصار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم کو اپنی قوت پر انحصار کرنا ہے''۔

قائداعظم محمد علی جناح کی مسلسل حوصلہ افزائی اور سیاسی تربیت کے نتیجے میں مسلمانوں نے 23 مارچ 1940ء کو ایک علیحدہ خودمختار مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ بعد میں یہ مطالبہ ''مطالبہ پاکستان'' کے نام سے معروف ہوا اور اسے منظور کرانے کے لیے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ 3 نومبر 1940ء کو قائداعظم نے ممبئی میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''مجھے امید ہے کہ مسلمان یہ بات ذہن نشین کر لیں گے کہ وہ اقلیت نہیں ہیں، وہ ایک قوم ہیں اور اس لحاظ سے ہمارا ایک علاقہ اور ایک علیحدہ ملک ہونا چاہیے''۔ دسمبر 1940ء میں ممبئی ہی میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''کسی بھی فرقے یا قوم کی طاقت کا انحصار تین چیزوں پر ہوتا ہے: تعلیم، ترقی یافتہ تجارت اور شجاعت۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان اوصاف سے خود کو لیس کر لیں''۔ 3 جنوری 1941ء کو آپ نے فرمایا: ''میں نے آج تک پاکستان کے خلاف کوئی ٹھوس دلیل نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں کہ پاکستان کے قیام سے ہندوستان کی فضا اور صورت حال مزید بہتر ہو جائے گی''۔ مارچ 1941ء میں کان پور میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''پاکستان کا قیام بہت ضروری ہے۔ اس بات پر جس قدر اصرار کیا جائے وہ کم ہے''۔ جنوری 1942ء میں کلکتہ میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''گزشتہ دو صدیوں کے دوران مسلمانوں نے بہت کچھ کھویا اور سختیاں برداشت کیں۔ لیکن اب کھوئی ہوئی چیزوں کو واپس لینے کا وقت آ گیا ہے۔ وقت ہمارے دعوے کی صداقت کا ثبوت دے گا''۔

تحریکِ پاکستان کی عظیم ترین جدوجہد میں کامیابی کے بعد پاکستان کا حصول جہاں بانیِ پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت اور اعلیٰ سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا وہیں اس بے مثال قومی یکجہتی کا بھی مظہر تھا جس کی تعلیم قائداعظم اپنی قوم کو مسلسل دیا کرتے تھے۔ آپ نے بار بار مسلمانوں سے فرمایا کہ ہماری نجات ہمارے مکمل اتحاد، باہمی اتفاق اور نظم و ضبط میں ہے، ہم امنِ عالم کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی تمام اقوام کے لیے بہت دوستانہ ہوگی۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی منظم قوم کے درست فیصلے کی مزاحمت نہیں کر سکتی۔ 30 اکتوبر 1947ء کو آپ نے یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''کوئی قوم ابتلاء اور ایثار کے بغیر آزادی حاصل نہیں کر سکتی۔ ہم شدید دشواریوں اور ناگفتہ بہ مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہم خوف اور اذیت کے تاریک ایام سے گزرے ہیں، لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اتحاد، حوصلے، خود اعتمادی اور اللہ کی تائید سے کامیابی ہمارے قدم چومے گی''۔

قائداعظم محمد علی جناح ہر مشکل مرحلے پر اپنی قوم کا حوصلہ بڑھاتے رہے، اس کے اندر عزم اور یکجہتی کی روح پھونکتے رہے، کیوں کہ آپ کا ایمان تھا کہ ہم جس قدر عظیم قربانیاں دیں گے اُسی قدر بہتر عمل اور کردار کا مظاہرہ کریں گے۔ 24 اکتوبر 1947ء کو آپ نے اپنے ایک پیغام میں فرمایا: ''آپ سب کے لیے میرا پیغام امید، حوصلے اور اعتماد کا پیغام ہے۔ آیئے، ہم باقاعدہ اور منظم طریقے سے اپنے تمام وسائل مجتمع کریں اور درپیش سنگین مسائل کا ایسے عزم اور نظم و ضبط سے مقابلہ کریں جو ایک عظیم قوم کا وتیرہ ہوتا ہے''۔

30 اکتوبر 1947ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے قائداعظم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: ''ایک متحد قوم کو جس کے پاس ایک عظیم تہذیب اور تاریخ ہے، کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کام، کام اور کام کریں۔ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ اپنا نصب العین یعنی اتحاد، ایمان اور تنظیم کبھی فراموش نہ کیجیے''۔

8 نومبر 1947ء کو قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ باوجود اُن خطرات کے جو ہمیں درپیش ہیں، آپ سب کامل اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ کام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پاکستان کا وقار پہلے سے زیادہ بلند رکھتے ہوئے اور اسلام کی عظیم روایات اور قومی پرچم کو بلند کیے ہوئے ان خطرات کے درمیان سے کامیابی کے ساتھ گزر جائیں گے''۔

بانیِ پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی جدوجہد، آپ کا عزمِ صمیم، آپ کی

دردمندی اور آپ کے تدبر و حکمت کے پیش نظر اکثر سیاسی رہنماؤں اور دانش وروں نے یہ بات کہی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح بیسویں صدی کی ملتِ اسلامیہ اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام تھے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جب کسی قوم کی تقدیر بدلنا ہو اور اسے دیگر اقوام کے مقابلے میں سربلندی و سرفرازی کے مقام پر پہنچانا ہو تو وہ اُس قوم میں ایسے باکمال اور بلند مرتبت انسان پیدا کرتا ہے جو اپنی جرات و ہمت، تدبر و خلوص اور اصابتِ رائے سے اُس کی تقدیر بدل دیتے ہیں اور وہ قوم زندہ اقوام میں ایسا مقام حاصل کر لیتی ہے جس پر دنیا رشک کرتی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح بھی ایک ایسے ہی عظیم لیڈر تھے جنہوں نے مایوسی اور ناامیدی کی فضا میں عزم و حوصلے کا چراغ جلایا اور اپنی لیاقت و ہمت، معاملہ فہمی، استقامت اور استقلال سے ایک مملکت وجود میں لانے کا عظیم کام انجام دیا۔

قائداعظم محمد علی جناح کے نزدیک پاکستان کا قیام ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی سمت میں اوّلین قدم تھا۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد پورے عالم اسلام کو متحد و منظم کر کے اس کی عظمتِ رفتہ بحال کرنا چاہتے تھے جیسا کہ قائداعظم کی تقاریر، بیانات اور مختلف تحریروں سے ثابت ہے۔ آپ نے پاکستان کی پہلی سال گرہ کے موقعے پر 14 اگست 1948ء کو قوم کے نام اپنے پیغام میں فرمایا: ''یاد رکھیے کہ قیام پاکستان ایسی حقیقت ہے جس کی تاریخِ عالم میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ تاریخِ عالم کی عظیم ترین مسلم مملکتوں میں اس کا شمار ہے اور وقت کے ساتھ اسے اپنا شان دار کردار ادا کرنا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم دیانت داری، خلوص اور بے غرضی سے پاکستان کی خدمت کرتے رہیں۔ مجھے اپنی قوم پر اعتماد ہے کہ وہ ہر موقعے پر خود کو اسلامی تاریخ، عظمت اور روایات کا امین ثابت کرے گی''۔

آج قیام پاکستان کو ستّر برس سے زاید کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران ہم نے قائداعظم کی ہدایت اور خواہش کے مطابق قومی اور بین الاقوامی امور میں کیا وہی کردار ادا کیا ہے جس کی قائداعظم ہم سے توقع رکھتے تھے؟ اس سوال پر ہمیں بہ حیثیت قوم ضرور غور کرنا چاہیے۔

قائداعظم اور سماجی انصاف

سماجی انصاف کے ضمن میں قائداعظم کے خیالات میں اشکال کی ذرا سی بھی گنجایش موجود نہیں ہے۔

تحریکِ پاکستان کی مختلف تعبیرات میں سے ایک تعبیر یہ بھی ہے کہ اس کی پشت پر مسلمان سرمایہ دار یا مسلم بورژوا طبقے کے مفادات کارفرما تھے۔ Hanna Papanek نے ایک تحقیقی مقالے میں بمبئی، گجرات اور کلکتہ کے مسلم بورژوا طبقے کے حقیقی عزائم پر سے پردہ اٹھایا ہے جس کا خیال تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد وہ ہندوستان میں اپنے تجارتی و صنعتی مراکز بہ دستور قائم رکھے گا، جب کہ پاکستان تو تمام تر اس کے لیے فرشِ راہ ہوگا۔

قائداعظم مسلم سرمایہ داروں کو ساتھ لے کر چلنے پر مجبور تھے کہ مسلم لیگ کو فنڈز کی ضرورت تھی، مگر وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ہوسِ زر سے ناواقف نہیں تھے۔ چناں چہ 1943 ہی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں انہوں نے تنبیہ کر دی تھی:

''پاکستان میں عوامی حکومت ہوگی اور یہاں میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کر دوں جو ایک ظالمانہ اور قبیح نظام کے وسیلے سے پھل پھول رہے ہیں اور اس بات نے انہیں اتنا خود غرض بنا دیا ہے کہ ان کے ساتھ عقل کی کوئی بات کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ عوام کی لوٹ کھسوٹ ان کے خون میں شامل ہو گئی ہے۔ انہوں نے اسلام کے سبق بھلا دیے ہیں۔ حرص اور خود غرضی نے ان لوگوں کو اس بات پر قائل کر رکھا ہے کہ دوسروں کے مفادات کو اپنے مفادات کے تابع بنا کر موٹے ہوتے جائیں۔ میں گاؤں میں گیا ہوں' وہاں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ہمارے عوام ہیں جنہیں دن میں ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں۔ کیا یہی تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے؟..... اگر پاکستان کا یہی تصور ہے تو میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔۔۔''

عدل عمرانی اور ایک عام مسلمان کی اقتصادی بہبود کے بارے میں قائداعظم کے یہ خیالات اپنی تشریح آپ ہیں۔ آج بھی یہ اتنے ہی برمحل ہیں جتنے اب سے نصف صدی قبل تھے۔

مسلمانوں کے سیاسی و جمہوری حقوق کی پاس داری

قائداعظم کی زندگی کے مشن میں جو دوسرا اہم ترین مقصد کارفرما تھا وہ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی و جمہوری حقوق کی پاس داری تھی۔ ایک وسیع حلقے کے نزدیک قائداعظم کی جمہوریت پسندی ہی محلِ نظر ہے۔ مثلاً کانگریسی مصنّفین کی یہ عمومی رائے ہے کہ جناح جمہوریت کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکے اور جب ہندوستان کی آزادی کا مرحلہ آیا تو انہوں نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ اب ہندو اکثریت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اقتدار میں آجائے گی، مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا مطالبہ کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم اول تا آخر جمہوریت کے قائل تھے۔ ان کی تعلیم برطانیہ میں ہوئی تھی جہاں انھوں نے گلیڈ اسٹون (Gladstone) اور جان

مارلے (John Morley) جیسے لبرل راہ نماؤں کے خیالات سے غیر معمولی اثرات قبول کیے تھے۔ قائداعظم اپنی سیاسی زندگی میں تقریباً 35 سال تک ہندوستان کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ اس دوران انہوں نے بارہا شہری آزادیوں اور قانون کی بالادستی کے لیے آواز اٹھائی۔ انہوں نے پریس سے متعلق اس مسودۂ قانون (Press Bill) کی سخت مذمت کی جس کے ذریعے حکومت نے آزادیٔ اظہار پر پابندی لگانے کے اختیارات حاصل کر لیے تھے۔ 1919 میں رولٹ ایکٹ کی آمد پر انہوں نے امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ ایسا کرتے وقت انہوں نے جمہوریت سے نہیں بلکہ برطانوی حکومت سے اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔ سول لبرٹیز پر ان کے ایمان کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ غدر پارٹی کے انقلابی، بھگت سنگھ کے لیے بھی ان ہی حقوق کا مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں جو انگریزوں کو حاصل تھے۔

ہم پُرامن رہنا چاہتے ہیں

17 اگست 1947 کو قائد نے پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر قوم کے نام اپنے ایک پیغام میں فرمایا ''ہم پُرامن رہنا چاہتے ہیں اور اپنے قریبی ہم سایوں اور ساری دنیا سے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم کسی کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہم اقوام متحدہ کے منشور کے حامی ہیں اور امنِ عالم اور عالمی خوش حالی کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔''

پاکستان کا مقدمہ اور بیرسٹر محمد علی جناح

آزادی انسان کا بنیادی حق بھی ہے اور فطری ضرورت بھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے عظیم قائد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف ایک غلام قوم کو غاصب انگریزوں سے آزادی دِلائی بلکہ ان کے لیے ایک آزاد اور خودمختار ملک بھی قائم کر کے دِکھایا۔ لیکن اس کٹھن اور مشکل کام کے لیے انہیں کتنی محنت اور کوشش کرنی پڑی، یہ ایک طویل داستان ہے۔ قائداعظمؒ ایک بااصول انسان اور سچے، کھرے، مخلص اور بے باک سیاست دان تھے۔ انہیں اپنے دین سے عقیدت، تاریخ سے واقفیت اور قوم سے محبت تھی۔ وہ ہر قسم کی حرص وہوس اور ذاتی غرض اور مفاد سے پاک تھے۔ وہ ہر بات کہنے سے پہلے اس پر خوب اچھی طرح غور وفکر کرتے، پھر کہیں بولتے اور جو بات کہتے پھر اس پر اٹل رہتے۔ پاکستان کے مخالفوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، ہزار مشکلات اور رُکاوٹیں پیدا کیں لیکن قائدِ اعظمؒ کی بلند ہمت اور عظیم شخصیت کے آگے ان کی ایک نہ چل سکی اور آخرکار پاکستان بن کر رہا۔

ہم ایک قوم ہیں

محمد علی جناح نے 1941 سے 1947 تک ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، راجندر پرشاد، راج گوپال اچاریہ، خضر حیات وغیرہ سے خط و کتابت اور مذاکرات کیے۔ لیکن ہندو مسلم مسئلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ راج گوپال اچاریہ نے 1944 میں مسلم لیگ اور کانگریس کی مفاہمت کے لیے ایک فارمولا مرتب کیا۔ اگرچہ اس فارمولے کی شرائط مطالبۂ پاکستان کی روح کے منافی تھیں، لیکن جناح نے ان شرائط پر ستمبر 1944 میں گاندھی سے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کردی۔ مذاکرات کے دوران گاندھی نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ جناح سے کانگریس کی جانب سے نہیں بلکہ ذاتی حیثیت میں ملاقات کر رہے ہیں۔ گاندھی نے یہ بھی کہا کہ وہ جناح کا یہ خیال تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی ذاتی حیثیت میں ایک علیٰحدہ قوم ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں قائداعظم محمد علی جناح کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔

اگرچہ قائداعظم آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور، 1940 میں دوقومی نظریے کی وضاحت کر چکے تھے، لیکن انہوں نے اس مرحلے پر گاندھی کو 17 ستمبر 1944 کو ایک خط میں واضح طور پر لکھا: ''ہمارا دعویٰ ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور معیار کی رو سے ہندوستان میں مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور یہ کہ ہم ایسی قوم ہیں جو اپنے خاص تہذیب وتمدن، زبان وادب، فنون وتعمیرات، اسم واصطلاحات، معیارِ قدر وتناسب، تشریعی قوانین، ضوابطِ اخلاق، رسم ورواج، نظامِ تقویم، تاریخ وروایات اور رجحانات وعزائم رکھتی ہے۔ غرض یہ کہ ہمارا ایک خاص نظریۂ حیات ہے اور زندگی کے متعلق ہم ایک ممتاز تصوّر رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اُصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔''

تصحیح فرمالیں

لاہور انٹرنیشنل کے ماہ ستمبر 2019 کے شمارے میں صفحہ نمبر 26 پر ''جہاز پھٹ گیا'' کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا اس کے لکھاری محترم ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ہیں جن کا نام چھپنے سے سہوًا رہ گیا تھا، احباب نوٹ فرمالیں۔

جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

جب جناح کا بنگلہ گنگا جل سے دھلوایا گیا

لاہور نیوز ڈیسک

یہ تصویر کراچی روانہ ہونے سے قبل لی گئی تھی جس میں محمد علی جناح اپنی بہن فاطمہ جناح کے ساتھ نظر آ رہے ہیں

پاکستان اپنے پہلے گورنر جنرل اور قاعد اعظم کے نام سے ملقب محمد علی جناح کا یوم پیدائش منا رہا ہے۔

سوشل میڈیا کے دس ٹاپ ٹرینڈز میں پانچ Muhammad Ali Jinnah، HappyBirthdayQAandPM، SalaamJinnah، # BeLikeJinnah اور # Happy Birthday Jinnah محمد علی جناح سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کے یوم پیدائش کے موقعے پر انڈیا کے سینیئر صحافی وویک شکلا نے انھیں یاد کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں سات اگست 1947 کا دن تھا محمد علی جناح وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے طیارے سے اپنی چھوٹی بہن فاطمہ جناح کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔

ہر چند کہ جناح کی شناخت سے ممبئی کا تعلق زیادہ ہے لیکن انھوں نے 1940 سے 1947 کے درمیان زیادہ تر وقت دہلی میں ہی گزارا تھا۔

اس دن انھوں نے تپتی گرمی کے باوجود شیروانی پہنی تھی جب کہ عام طور پر وہ سوٹ پہنتے تھے۔ ایئر پورٹ پر انھیں رخصت کرنے بہت سے لوگ آئے تھے جن میں صنعت کار سیٹھ رام کرشن ڈالمیا بھی تھے۔

محمد علی جناح 1940 سے پہلے بھی دہلی آتے رہے تھے اور وہ امپیریل ہوٹل میں ہی ٹھہرتے تھے جو ان کے شاہانہ مزاج سے مطابقت رکھتا تھا۔

جناح نے 1939 میں دہلی میں اپنا ٹھکانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اب ہوٹلوں میں رہنے سے بات نہیں بننے والی تھی اس لیے ان کے لیے ایک عدد بنگلے کی تلاش شروع ہوئی۔

کافی تلاش کے بعد 10 اورنگزیب روڈ (اب اے پی جے عبدالکلام روڈ) پر واقع بنگلہ خریدا گیا جس کا رقبہ تقریباً ڈیڑھ ایکڑ ہے۔ اس دو منزلہ بنگلے کا ڈیزائن ایڈورڈ لٹین کی ٹیم کے رکن اور کناٹ پلیس کے ڈیزائنر رابرٹ ٹور رسل نے تیار کیا تھا۔

دہلی میں ان کے غیر سیاسی دوستوں میں سردار سوبھا سنگھ (معروف صحافی اور مصنف خوشونت سنگھ کے والد) اور سیٹھ رام کرشن ڈالمیا بھی تھے۔

ڈالمیا کی بیٹی اور دی سیکرٹ ڈائری آف کستوربائی مصنفہ نیلما ڈالمیا نے بتایا: 'میرے والد سیٹھ رام کے محمد علی جناح کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ جناح کا ہمارے اکبر روڈ اور سکندرا روڈ پر واقع بنگلوں میں باقاعدگی سے آنا جانا رہتا تھا۔'

ہمیشہ کے لیے دہلی چھوڑنے سے ایک دن قبل ڈالمیا کے سکندرا روڈ والے بنگلے پر جناح کو کھانے پر بلایا۔ ان کی بہن فاطمہ جناح بھی آئیں، رام کرشن ڈالمیا کی بیوی نندنی ڈالمیا بھی میزبانی کر رہی تھیں۔

نیلما بتاتی ہیں: 'چونکہ اگلے دن جناح جا رہے تھے اس لیے ماحول میں اداسی کا پہلو شامل تھا۔'

پاکستان جانے سے پہلے جناح نے اپنا بنگلہ تقریباً ڈھائی لاکھ روپے میں ڈالمیا کے ہاتھوں فروخت کیا تھا۔ حالانکہ دونوں دوست تھے پھر بھی جناح ڈھائی لاکھ روپے سے کم پر بنگلہ فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

خریدنے کے بعد ڈالمیا نے بنگلے کو گنگا جل سے دھلوایا، جناح کے دہلی چھوڑتے ہی بنگلے کے اوپر لہرانے والے مسلم لیگ کا پرچم اتارا گیا، اور اس کی جگہ گئو رکشا تحریک کا پرچم لگوایا گیا، یعنی مسلمانوں کے غیر متنازع رہنما کی کٹر ہندو وادی شخص سے گہری دوستی تھی۔

(خیال رہے کہ ہندو مذہب میں گنگا کے پانی کی بہت اہمیت ہے اور یہ پاک تصور کیا جاتا ہے جبکہ اس کا ہر طرح کی مذہبی تقریب میں استعمال ہوتا ہے)

1964 تک ڈالمیا نے جناح سے خریدے جانے والے بنگلے کو اپنے پاس رکھا اور پھر ہالینڈ حکومت کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اس کے بعد سے اس بنگلے کا استعمال نئی دہلی میں ہالینڈ کے سفیر کی رہائش کے طور پر ہو رہا ہے۔

اس بنگلے میں پانچ بیڈ روم، ایک بڑا ڈرائنگ روم، میٹنگ روم اور بار وغیرہ ہیں، آج اس کی قیمت کروڑ روپے لگائی جاتی ہے۔

'تقسیم کے وقت ہجرت کا تحریری معاہدہ نہیں ہوا تھا'

تحریر ریاض سہیل

سندھ کے ایک سیاسی خاندان ہارون فیملی کے فرد اور پاکستان کے اقوام متحدہ میں مستقل نمائندہ حسین ہارون نے قیام پاکستان کی تاریخ اور سندھ کی صورتحال پر بات کی۔

سندھ کی تاریخ نویس ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے سیاست دانوں کو اندازہ نہیں تھا کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت اتنے پیمانے پر ہجرت ہوگی اور اس حوالے سے فریقین کے درمیان کوئی تحریری معاہدہ بھی نہیں ہوا تھا۔

کراچی میں پہلے 'سندھ لٹریچر فیسٹول' میں خطاب کرتے ہوئے انھوں نے برطانوی راج کی تاریخ اور قیام پاکستان اور اس کے بعد کی صورتحال پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

ان دنوں میں ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کے والد ایوب کھوڑو، عبداللہ ہارون اور جی ایم سید سندھ کی سیاست میں سرگرم تھے۔ حمیدہ کھوڑو نے بتایا کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا کہ انڈیا سے ہجرت ہوگی کیونکہ صرف پنجاب ایسا صوبہ تھا جس کا بٹوارا ہوا اس لیے وہاں سے ہجرت کا امکان تھا لیکن سندھ کے اس وقت کے سیاست دانوں کو بالکل ہی اندازہ نہیں تھا کہ دوسرے علاقوں سے اس قدر نقل مکانی ہوگی کہ یہاں کی سماجی، سیاسی اور معاشی صورتحال تبدیل ہوجائے گی۔

سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تحریک اور محمد علی جناح کے بنیادی نکات میں اس کے ذکر پر بات کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ بمبئی میں شامل ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا، اگر کوئی میٹرک کا امتحان دینا چاہتا تھا تو اس کو بحری جہاز پر سوار ہو کر بمبئی جانا پڑتا تھا۔

انگریز دور میں خیبر پختونخوا اور پنجاب میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے حمیدہ کھوڑو نے کہا کہ انگریز سندھ میں یونیورسٹی بنانے کے لیے تیار نہیں تھا وہ کہتے تھے کہ پہلے پڑھے لکھے لوگ تیار کریں بعد میں یونیورسٹی کھولیں گے۔ بقول ان کے سندھ میں جو انگریز افسران تعینات تھے وہ دوسرے درجے کی حیثیت رکھتے تھے اور سندھ کو صرف شکار گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

ایک سوال کے جواب میں حمیدہ کھوڑو کا کہنا تھا کہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے وقت ایسی صورتحال نہیں تھی کہ اس وقت کے سیاست دان سندھ کی آزادی کا مطالبہ کرتے اور یہ تاثر بھی درست نہیں ہے کہ سندھ کو پاکستان میں شامل ہونے کے علاوہ آزادی کا بھی آپشن دیا گیا تھا۔

'بلوچستان ریاست سے برطانیہ کا معاہدہ تھا کہ وہ ہندوستان سے نکلنے پر بلوچستان کو آزاد کریں گے، اس معاہدے کی یاددہانی کے لیے خان آف قلات نے محمد علی جناح کو اپنا وکیل بنا کر لندن بھیجا تھا لیکن ان کی ایک بھی نہیں سنی گئی اور انھیں انڈیا یا پاکستان میں شامل ہونے کا مشورہ دیا گیا۔ سندھ کے سیاست دانوں کو اندازہ تھا کہ ان کا مطالبہ تسلیم نہیں ہوسکتا اس لیے انھوں نے ایسا کوئی مطالبہ ہی نہیں کیا۔

ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو نے قیام پاکستان کے بعد کی سیاست پر تفصیلی بات کی اور بتایا کہ وفاقی دارالحکومت کراچی اور ملتان میں بنانے کی تجویز تھی لیکن اسے کراچی میں بنانے کا فیصلہ ہوا جس کے لیے حکومت سندھ نے بیرکس اور دفاتر بنائے لیکن بعد میں کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کی بات کی گئی جس پر اس وقت کے سیاست دانوں نے کہا کہ برطانیہ راج میں کلکتہ اگر بنگال اور انڈیا کا دارالحکومت ہوسکتا ہے تو کراچی کیوں نہیں۔

حمیدہ کھوڑو کے والد ایوب کھوڑو سندھ کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں، حمیدہ کھوڑو نے والد کے لیاقت علی خان اور محمد علی جناح کے ساتھ اختلاف کا بھی ذکر کیا، انھوں نے بتایا کہ ایک اجلاس میں لیاقت علی خان نے شکوہ کیا کہ ان کے زرعی فارم کو پانی نہیں مل رہا جس پر ان کے والد نے انھیں بتایا کہ یہاں اتنی بڑی آبادی جو

آئی ہے اس کو پینے کے لیے پانی دیا جا رہا ہے۔

حمیدہ کھوڑو کے مطابق جب پاکستان نے کمشیر میں پہلی لڑائی لڑی تو وفاقی حکومت نے حکومت سندھ کو پیسے دینے کے لیے کہا ان کے والد نے اعتراض کیا کہ یہ پیسے یہاں کی تعلیم اور صحت کے شعبوں کے لیے ہیں وہ نہیں دے سکتے جس کے بعد مطلوبہ رقم قرضے کے طور پر وفاق پاکستان کو دی گئی اس کے بعد وہ واپس ہوئی یا نہیں معلوم نہیں۔ ان کے مطابق اسی کشیدگی کی وجہ سے محمد علی جناح کے کہنے پر ان کے والد کی حکومت برطرف کر دی گئی۔

کراچی کے مقامی ہوٹل میں جاری تین روز سندھ لٹریچر فیسٹیول کا سنیچر کو دوسرا روز تھا، جس میں مختلف نشستوں میں صحافی وسعت اللہ خان نے میڈیا اور سلطانہ صدیقی نے ڈرامے اور فلم پر روشنی ڈالی، اس کے علاوہ سندھی زبان کے مسائل پر جی اے الانا، شوکت شورو، مظہر الحق صدیقی سمیت دیگر ادیبوں، دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شام کو مشاعرے اور محفل موسیقی کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

سندھ کے ایک اور سیاسی خاندان ہارون فیملی کے فرد اور پاکستان کے اقوام متحدہ میں مستقل نمائندہ حسین ہارون نے قیام پاکستان کی تاریخ اور سندھ کی صورتحال پر بات کی۔ ان کا کہنا تھا کہ عالمی جنگ میں کانگریس نے برطانوی راج کی مدد نہیں کی تھی اس لیے وہ پورا انڈیا کانگریس کو نہیں دینا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اس کو سزا دینے لیے انڈیا کی تقسیم کا پلان بنایا۔

حسین ہارون نے اپنے والد کی یادداشتیں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ آغا خان انڈیا کے پہلے آئین کے لیے لندن گول میز کانفرنس کے سربراہ کیسے بنے۔

انھوں نے بتایا کہ محمد علی جناح اور سلطان محمود آغا خان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے ان کے والد عبداللہ ہارون دونوں کے مشترکہ دوست تھے، آغا خان نے انھیں بلایا اور کہا کہ آپ ہمارے مشترکہ دوست ہیں جناح کو کہیں کے پاکستان کی تحریک جاری رکھے اور انھوں نے یہ پیغام جناح کو پہنچایا، جس پر جناح نے انہیں کہا کہ آغا خان کو کہو کو لندن میں گول میز کانفرنس کی سربراہی کریں۔

حسین ہارون کے مطابق جب ان کے والد نے اس بات سے آغا خان کو آگاہ کیا تو انھوں نے کہا کہ گاندھی جی اکثریت کے رہنما ہیں اس لیے انہیں اس وفد کی قیادت کرنی چاہیے۔ 'جب حتمی فیصلے کے لیے اجلاس جاری تھا تو جناح کام کا کہہ کر اٹھ گئے، آغا خان نے گاندھی کا نام تجویز کیا جس پر گاندھی نے کہا کہ آغا خان سے بڑی شخصیت کوئی اور ہے کیا۔ جس پر آغا خان نے کہا کہ اگر گاندھی جی یہ سوچتے ہیں تو وہ اس سربراہی کے لیے راضی ہیں۔'

دو ملک۔ دو رویے

لاہور انٹرنیشنل ڈیسک

عبدالکلام کا باپ مسجد میں امام تھا۔ وہ خود بھی ہمیشہ عمل کرنے والا مسلمان رہا، نماز، روزہ، اور دیگر فرائض پورے کرنے والا مسلمان۔ وہ فزکس اور ایروسپیس انجینیرنگ میں تعلیم یافتہ تھا۔ حالانکہ وہ مسلمان تھا، مگر اس کے باوجود بھارت نے اُسے اپنے دو سب سے زیادہ حساس اداروں یعنی Defence Research and Development Organisation اور Indian Space Research Organisation میں تعینات کر دیا۔ یعنی اپنی فوج اور اپنے خلائی پروگراموں کے سب سے حساس ترین اداروں کی اہم ترین پوزیشنوں میں۔ عبدالکلام نے بھی کمال کر دکھایا۔ ایک جانب خلائی پروگرام میں کامیابیاں حاصل کیں، دوسری جانب بھارت کو میزائیل ٹیکنالوجی سے آراستہ کر دیا، اسی لیے آپکو بھارت کا "میزائل مین" کا لقب دیا گیا۔ صرف یہی نہیں، 2002 میں آپ اکثریت ووٹ لے کر جیتے اور بھارت کے صدر بنے۔ بھارت کا سب سے بڑا اعزازی ایوارڈ "بھارت رتنا" سے آپکو نوازا گیا۔ اسکے علاوہ مُلک بھر کی بہت سی عمارتیں، سڑکیں، حتیٰ کہ ایک جزیرہ بھی آپ کے نام سے منسوب کیا گیا۔ گاندھی کے بعد آپ کو دوسرا عظیم ترین بھارتی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ بھارتی عوام آپ کو اپنا ہیرو اور آئیڈیل قرار دیتی ہے۔ آپکو ملنے والے ایوارڈز، اعزازات، وغیرہ کا شمار ممکن نہیں۔ آپ کا نام عبدالکلام Abdul Kalam تھا۔ ایک اقلیت کو اپنا ہیرو بنانے سے بھارتیوں کا ہندو مذہب خطرے میں بھی نہیں پڑا، اُنہیں ایسا بھی نہیں لگا کہ ایک اکیلا شخص تمام بھارت کو مسلمان بنا دے گا، اُنکی مُلکی سالمیت کو دھچکا بھی نہیں لگا، قومی سلامتی خطرے میں بھی نہیں پڑی، بلکہ مُلک ترقی کر گیا۔

سرحد کے بالکل ساتھ ہی ایک دوسرا مُلک بھی ہے۔

جہاں ایک ملتی جُلتی شخصیت پیدا ہوئی، بلکہ عبدالکلام سے بھی بڑی شخصیت۔ اس شخص نے پاکستان میں سائنس کی بُنیاد ڈالی۔ خلائی ادارے SUPARCO کی بُنیاد ڈالی۔ ایٹمی ادارے PAEC کی بُنیاد ڈالی۔ فزکس اور ریاضی کے تحقیقی شعبہ جات کے آغاز کی بُنیاد ڈالی۔ ایٹمی تحقیقی ادارے PINSTECH کی بُنیاد ڈالی۔

(باقی صفحہ 15 پر ملاحظہ فرمائیں)

انڈیا کا پہلا بجٹ لیاقت علی خان نے پیش کیا تھا

تحریر وویک شکلا۔ سینئر صحافی، دہلی

انڈیا کا 1946 کا بجٹ لیاقت علی خان نے پیش کیا تھا جو ڈیڑھ سال بعد پاکستان کے پہلے وزیراعظم بنے۔

مرکزی قانون ساز اسمبلی میں پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں قائم عبوری حکومت کے وزیر خزانہ لیاقت علی خان نے دوفروری کو بجٹ پیش کیا، اسی عمارت میں جسے آج پارلیمنٹ ہاؤس کہا جاتا ہے۔

لیاقت علی خان محمد علی جناح کے خاص ساتھی تھے۔ عبوری وزیراعظم نہرو کی کابینہ میں سردار پٹیل، بھیم راؤ امبیڈکر، بابو جگ جیون رام جیسے قدآور بھی شامل تھے۔

سوشلسٹ بجٹ

لیاقت علی تقسیم سے پہلے میرٹھ اور مظفر نگر سے یوپی اسمبلی کے لیے انتخابات بھی لڑتے تھے، ویسے ان کا تعلق کرنال کے نواب جاٹ خاندان سے تھا۔

وہ جناح کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ جب عبوری حکومت کی تشکیل ہوئی تو مسلم لیگ نے انھیں اپنے نمائندے کے طور پر بھیجا۔ انھیں پنڈت نہرو نے وزارتِ خزانہ کی ذمہ داری سونپی تھی۔

لیاقت علی خان نے اپنی بجٹ تجاویز کو سوشلسٹ بجٹ قرار دیا تھا لیکن ان کے بجٹ سے ملک کی انڈسٹری نے کافی ناراضی کا اظہار کیا۔ لیاقت علی خان پر الزام لگا کہ انھوں نے تجاویز بہت ہی سخت رکھیں جس سے کاروباری لوگوں کے مفادات کو چوٹ پہنچی۔

ہندو مخالف بجٹ

لیاقت علی خان پر یہ بھی الزام لگا کہ انھوں نے ایک طرح سے ہندو مخالف بجٹ پیش کیا ہے۔ انھوں نے تاجروں پر ایک لاکھ روپے کے کل منافع پر 25 فیصد ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی تھی اور کارپوریٹ ٹیکس کو دوگنا کر دیا تھا۔

اپنی متنازع بجٹ تجاویز میں لیاقت علی خان نے ٹیکس چوری کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی نیت سے ایک کمیشن بنانے کا بھی وعدہ کیا۔

بھارت کی تقسیم پر دہلی میں ایک کانفرنس کے دوران نہرو، پٹیل، کرپلانی، ماؤنٹبیٹن کے ساتھ لیاقت علی خان

کانگریس میں سوشلسٹ ذہن کے رہنماؤں نے ان قراردادوں کی حمایت کی لیکن سردار پٹیل کی رائے تھی کہ لیاقت علی خان گھنشیام داس، جمنالال جیسے ہندو تاجروں کے خلاف سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت کارروائی کر رہے ہیں۔

تحریک آزادی

یہ تمام صنعتکار کانگریس سے منسلک تھے۔ یہ کانگریس کو مالی مدد دیتے تھے۔

گھنشیام داس بڑلا اور جمنالال بجاج تو گاندھی کے قریبی لوگوں میں تھے۔ بڑلا نے کچھ دیگر صنعت کاروں کے ساتھ مل کر 1927 میں انڈین چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری قائم کی تھی۔ بڑلا دیس کی تحریک آزادی کے کٹر حامی تھے اور مہاتما گاندھی کی سرگرمیوں کے لیے فنڈز فراہم کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

ظاہر ہے کہ لیاقت علی خان کے بجٹ کا اثر مسلمان اور پارسی تاجروں پر بھی ہوتا لیکن یہ تو حقیقت تھی کہ کاروبار پر ہندوؤں کا غلبہ تو تب بھی تھا ہی۔

عبوری حکومت

ٹاٹا اور گودریج جیسے پارسیوں کے گروپ اس وقت بھی تھے۔ مسلم سماج سے تعلق رکھنے والا ایک بڑا گروپ فارماسیکٹر کا سپلا تھا۔ اس کے بانی کے حامد تھے۔ وہ بھی گاندھی جی کے حامی تھے۔ اس دور میں سپلا کے علاوہ شاید کوئی بڑا گروپ نہیں تھا جس کی کمان مسلم مینجمنٹ کے پاس ہو۔

لیاقت علی خان پر یہ بھی الزام لگنے لگے کہ وہ عبوری حکومت میں ہندو وزرا کے

اخراجات اور تجاویز کو ہری جھنڈی دکھانے میں خاصا وقت لیتے ہیں۔ سردار پٹیل نے تو یہاں تک کہا تھا کہ وہ لیاقت علی خان کی اجازت کے بغیر ایک چپراسی بھی مقرر نہیں کر سکتے۔

تقسیم کے بعد

لیاقت علی خان کے دفاع میں بھی بہت سے لوگ آگے آئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ہندو مخالف نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی بیوی گلِ رعنا بنیادی طور پر ہندو خاندان سے ہی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا خاندان ایک عرصہ پہلے عیسائی ہو گیا تھا۔

لیاقت علی خان بجٹ (موجودہ تلک لین) والے گھر سے لے کر مرکزی قانون ساز اسمبلی (موجودہ پارلیمنٹ) کی عمارت گئے تھے۔ ان کی رہائش ملک کے بٹوارے کے بعد انڈیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر کی سرکاری رہائش کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

بے نظیر کا قتل

لیاقت علی خان کو 1951 میں راولپنڈی میں ایک اجتماع میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا. قاتل کو تب ہی سکیورٹی اہلکاروں نے مار ڈالا تھا جو ایک افغان شہری تھا۔ جس میدان میں لیاقت علی خان کا قتل ہوا تھا، اسی میدان میں کئی دہائیوں بعد بے نظیر بھٹو کا قتل ہوا۔

آزاد ہندوستان کا پہلا بجٹ 26 نومبر، 1947 کو آر کے شمگم شیٹی نے پیش کیا تھا لیکن یہ ایک طرح سے ملک کی معیشت کا جائزہ ہی تھا۔ اس میں کسی نئے ٹیکس کی تجویز نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ 1948-49 کا بجٹ پیش ہونے میں محض 95 دن باقی تھے۔

جس میدان میں لیاقت علی کا قتل ہوا تھا، اسی میدان میں کئی دہائیوں بعد بے نظیر بھٹو بھی ماری گئیں

دو ملک۔ دو رویے

پاکستانی طلبا کو سائنسی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، اور سائنس میں تحقیق کی تو دُنیا میں دھوم مچا دی یہاں تک کہ بالآخر آپ پہلے پاکستانی سائنسدان تھے جنہیں سائنس کے کسی شعبہ میں نوبیل پرائز دیا گیا۔ مگر ان بے پناہ اور ان گنت خدمات کے باوجود پاکستانیوں نے کبھی بھی اسے اپنا ہیرو تسلیم نہیں کیا، بلکہ گالیاں ہی دیں، صِرف اور صِرف اسلیے کہ مذہبی عقائد مختلف تھے۔ تنگ ذہنی، تنگ نظری، تنگ دلی، تعصب، نرگسیت، کی بنا پر۔

دو ملک۔

دو رویے۔

ایک میں مساوات و برابری۔ دوسرے میں تعصب اور اقربا پروری۔

ایک میں میرٹ کو ترجیح۔ دوسرے میں عقیدہ کو ترجیح۔

ایک ملک سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر اوج ثریا پر پہنچ گیا ہے۔ دوسرا اس بات پر لڑ رہا ہے کہ چاند ننگی آنکھ سے دیکھنا حلال ہے یا عدسے میں حرام۔

ایک اپنے سائنسدانوں کو اپنا ہیرو کہتے ہیں۔ دوسرے اپنے سائنسدانوں کو گالیاں دیتے ہیں۔

دو ملک۔

دو رویے۔

جس طرح ہم نیوٹن۔ آئن سٹائن۔ گلیلیو اور بے شمار "کافر" سائنس دانوں کی بطور سائنٹسٹ عزت و توقیر اور انکی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہیں۔ عبدالسلام کی سائنسی تحقیق سے بھی کھلے دل سے استفادہ کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ ملک میں سائنس اور علم کو فروغ دیں۔ ایک پاکستانی نیشنل اگر انسانیت کی فلاح کیلیے کوئی کارہائے نمایاں انجام دے تو یہ ہمارے لیے باعث افتخار ہونا چاہیے۔

بیگم رعنا لیاقت علی خان: کماؤں کی برہمن لڑکی

(خاتون اول، اسلامی جمہوریہ پاکستان)

تحریر: ریحان فضل

بیگم رعنا ایک کماؤ برہمن خاندان سے تعلق رکھتی تھیں

امریکہ میں پاکستان کے سابق سفیر جمشید مارکر کہتے تھے کہ رعنا لیاقت علی جب کسی کمرے میں داخل ہوتی تھیں تو وہ کمرہ خود ہی روشن ہو اٹھتا تھا۔

ایک مرتبہ برج کھیلتے ہوئے لیاقت علی نے اپنے رہنما محمد علی جناح سے کہا کہ آپ اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ جناح نے تپاک سے کہا مجھے دوسری رعنا لا دو، میں فوراً شادی کر لوں گا'۔

رعنا لیاقت علی کی پیدائش 13 فروری 1905 میں شمالی ہند کے علاقے الموڑہ میں ہوئی تھی اور انکا نام آئرین روتھ پنت تھا۔

وہ کماؤں کے ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتی تھیں لیکن بعد میں انھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔

رعنا لیاقت علی کی سوانح کتاب دی بیگم کی شریک مصنفہ دیپا اگروال بتاتی ہیں کہ وہ ایک آزاد خیال خاتون تھیں اور ان میں زبردست اعتماد تھا۔

86 سال کی اپنی زندگی میں انھوں نے 43 سال انڈیا میں جبکہ اتنا ہی عرصہ پاکستان میں گذارا۔ انھوں نے نہ صرف اپنی انکھوں کے سامنے تاریخ رقم ہوتے دیکھی بلکہ اس کا حصہ بھی بنیں۔

جناح سے لے کر جنرل ضیا الحق تک سبھی کے سامنے وہ اپنی بات کہنے سے کبھی نہیں ہچکچائیں۔ ایم اے کی اپنی کلاس میں وہ اکیلی لڑکی تھیں اور لڑکے انھیں تنگ کرنے کے لیے ان کی سائیکل کی ہوا نکال دیتے تھے۔

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر پشپیش پنت کا ننیھال بھی اسی جگہ تھا جہاں آیرین روتھ پنت کا خاندان رہا کرتا تھا۔ پروفیسر پشپیش پنت بتاتے ہیں کہ میں تقریباً 60 سال پہلے آٹھ یا دس برس کی عمر میں اپنی ننھیال والے مکان میں رہا کرتا تھا۔

'لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے کہ ان کی بہن پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے بیاہی گئی تھیں اور ان لوگوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا'۔

ان کا کہنا تھا کہ رعنا کے دادا ایک اعلی ذات کے برہمن تھے اور وہاں کے مشہور وید یا حکیم تھے اور جب انھوں نے عیسائی مذہب قبول کیا تو پورے علاقے میں ہلچل مچ گئی تھی کیونکہ اکثر نیچی ذات کہے جانے والے لوگ ہی مذہب تبدیل کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب رعنا نے ایک مسلمان سے شادی کر لی تو لوگ اور باتیں کرنے لگے'۔

اس دور میں الموڑے کے دقیانوسی معاشرے میں ماڈرن کہی جانے والی پنت بہنیں نہ صرف پورے شہر میں موضوعِ بحث ہوا کرتی تھیں بلکہ کچھ لوگ انھیں رشک کی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے۔

مشہور ناول نگار کی بیٹی ایرا پانڈے لکھتی ہیں میرے نانا کے برابر والا گھر ڈینیل پنت کا تھا جن کا خاندان مسیحی مذہب قبول کر چکا تھا لیکن ایک زمانے میں وہ ہماری ماں کے رشتے دار ہوا کرتے تھے'۔

ہمارے نانا نے ان کی دنیا کو ہماری دنیا سے الگ کرنے کے لیے ہمارے گھروں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی تھی اور ہمیں سخت ہدایت تھی کہ ہم دوسری جانب دیکھنے کی کوشش بھی نہ کریں'۔

میری ماں شوانی نے لکھا تھا کہ ان کے گھر کے باورچی خانے میں پکنے والے ذائقے دار گوشت کی پاگل کر دینے والی مہک ہماری بے رونق برہمن رسوئی میں پہنچ کر ہماری دال اور آلو کی سبزی اور چاول کو شرمندہ کر دیتی تھی'۔

برلن وال کے اس پار کے بچوں میں ہینری پنت میرے خاص دوست تھے اور ان کی بہنیں اولگا اور موریل جب اپنی جارجیٹ کی ساڑھی میں الموڑہ کے بازار میں چہل قدمی کرتی تھی تو ہم لوگ رشک سے مر ہی جاتے تھے۔

لیاقت علی خان اور بچوں کے ساتھ بیگم رعنا

آئرین پنت یعنی رعنا کی تعلیم لکھنؤ کے لال باغ سکول اور پھر وہیں کے مشہور آئی ٹی کالج میں ہوئی۔

متعدد اہم مصنف جیسے قراۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، اور عطیہ حسین اسی کالج سے تعلیم حاصل کر کے نکلی ہیں۔

آئرین کی بچپن کی دوست مائلز اپنی کتاب اے ڈائنو موان سِلک میں لکھتی ہیں وہ جہاں بھی ہوتی تھیں ان کے اردگرد زندہ دلی ہوتی تھی۔ کالج میں لڑکے بلیک بورڈ پر انکی تصویر بنایا کرتے تھے لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔'

مسلم لیگ کے رہنما لیاقت علی سے ان کی ملاقات بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

دیپا اگروال بتاتی ہیں ان دنوں ریاست بہار میں سیلاب آیا ہوا تھا اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علموں نے فیصلہ کیا وہ ایک پروگرام کر کے وہاں کے لیے فنڈ جمع کریں گے۔

آئرین پنت جو لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کر رہی تھیں شو کے ٹکٹ فروخت کرنے پارلیمنٹ پہنچیں اور وہاں انھوں نے پہلا دروازہ کھٹکھٹایا وہ لیاقت علی خان نے کھولا۔ لیاقت ٹکٹ خریدنے میں جھجک رہے تھے اور بڑی مشکل سے انھوں نے ایک ٹکٹ خریدا۔

دیپا اگروال بتاتی ہیں آئرین نے کہا کہ کم از کم دو ٹکٹ تو خریدیں اور شو دیکھنے کے لیے کسی کو اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ جواب میں لیاقت علی نے کہا کہ میں کسی کو نہیں جانتا کس کو اپنے ساتھ لاؤں اس پر آئرین بولیں میں آپ کے لیے ایک ساتھی کا انتظام کرتی ہوں اور اگر کوئی نہیں ملا تو میں ہی آپ کے ساتھ بیٹھ کر شو دیکھ لوں گی اور لیاقت ان کی یہ درخواست رد نہیں کر پائے۔

لیاقت علی اپنے دوست مصطفی رضا کے ساتھ شو دیکھنے پہنچے لیکن کافی تاخیر کے ساتھ۔ بعد میں آئرین اندر پرستھ کالج میں لیکچرار ہو گئیں۔ جب انھیں خبر ملی کہ لیاقت علی کو لیجیسلیٹیو اسمبلی کا سربراہ منتخب کیا گیا ہے تو انھوں نے انھیں خط لکھ کر مبارکباد دی۔

جواب میں لیاقت علی نے لکھا کہ جان کر خوشی ہوئی آپ دلی میں ہیں جو میرے شہر کرنال کے بالکل نزدیک ہے اس بار جب میں لکھنؤ جاتے ہوئے دلی سے گزروں گا تو کیا آپ میرے ساتھ چائے پینا پسند کریں گی؟'

آئرین نے ان کی دعوت قبول کی اور یہیں سے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور 16 اپریل 1933 کو بات شادی تک پہنچ گئی۔

لیاقت علی ان سے دس سال بڑے تھے اور پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے کے باپ بھی۔ لیاقت علی کی شادی ان کی کزن جہاں آرا سے ہو چکی تھی اور ان کے بیٹے کا نام وِلایت علی خان تھا۔

بہر حال ان کی شادی ہوئی اور جامع مسجد کے امام نے ان کا نکاح پڑھوایا اور آئرین نے اسلام قبول کیا اور ان کا نام گل رعنا رکھا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں اس وقت لیاقت علی سیاسی افق کے ایک ابھرتے ہوئے ستارے تھے اور محمد علی جناح کے بہت نزدیک بھی۔

دیپا اگروال بتاتی ہیں کہ لیاقت علی کو فوٹو گرافی کا شوق تھا انھوں نے موسیقی سیکھی تھی، پیانو اور طبلہ بجاتے تھے اور گاتے بھی اچھا تھے۔ ان کی پارٹیوں میں نہ صرف غزلوں کا دور چلتا تھا بلکہ انگریزی گانے بھی سننے کو ملتے تھے۔

دونوں میاں بیوی برج کھیلنے کے شوقین تھے۔ پانچ فٹ لمبی رعنا کو نہ تو زیور کا شوق تھا اور نہ ہی کپڑوں کا انھیں ایک پرفیوم پسند تھا جوائے۔ جبکہ لیاقت علی کو امرود بہت پسند تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ اس سے خون صاف ہوتا ہے۔

جانے سے پہلے جہاں جناح نے اورنگزیب روڈ والا بنگلہ رام کرشن ڈالمیہ کو فروخت کیا تھا وہیں لیاقت علی نے اپنا بنگلہ پاکستان کو عطیہ کر دیا تھا۔

اسے آج بھی پاکستان ہاؤس کہا جاتا ہے اور وہاں آج بھی انڈیا میں تعینات پاکستان کے سفیر رہتے ہیں۔

دیپ اگروال بتاتی ہیں کہ لیاقت علی نے اپنے گھر کی ایک ایک چیز پاکستان کو دیدی تھی اور وہ صرف ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں لے کر پاکستان گئے تھے۔

اس سامان میں ایک سوٹ کیس سگریٹ لائٹروں سے بھرا تھا اور وجہ یہ تھی کہ انھیں سگریٹ لائٹر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔

اگست 1947 میں لیاقت علی، ان کی بیگم رعنا لیاقت علی اور دو بیٹوں اشرف اور اکبر نے دلی کے ویلنگٹن ہوائی اڈے سے کراچی کے لیے پرواز کیا۔

لیاقت علی کا قتل

لیاقت علی پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم بنے اور رعنا پہلی خاتونِ اول۔ لیاقت نے انھیں اپنی کابینہ میں اقلیتوں اور خواتین کی بہبود سے متعلق وزارت دی۔

ابھی چار سال ہی گذرے تھے کہ راولپنڈی میں ایک جلسے میں خطاب کے دوران

لیاقت علی کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی موت کے بعد بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ رعنا اب واپس انڈیا چلی جائیں گی لیکن انھوں نے پاکستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔

''کتاب دی بیگم'' کی مشترک مصنفہ تہمینہ عزیز ایوب بتاتی ہیں کہ ابتدا میں وہ بہت پریشان تھیں اور گھبرائیں بھی کہ اب میں کیا کروں گی کیونکہ لیاقت ان کے لیے کوئی پیسہ یا جائیداد چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

ان کے اکاؤنٹ میں محض 300 روپے تھے اور ان کا بڑا مسئلہ بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کی مدد بھی کی۔

پاکستان کی سفیر بنا دی گئیں

حکومتِ پاکستان نے انھیں ماہانہ دو ہزار روپے کا وظیفہ دینا شروع کر دیا۔ تین سال بعد انھیں ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر کے طور پر بھیج دیا گیا جس سے انھیں کچھ آسرا ہوا۔ یہ تقرری وزیر خارجہ چودھری محمد ظفر اللہ خان نے کی تھی۔

بیگم رعنا نے 1949 میں ہی آل پاکستان وومن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھ دی تھی اور بیرون ملک ہوتے ہوئے بھی وہ اس تنظیم سے وابستہ رہیں۔ ہالینڈ کے بعد انھیں اٹلی میں پاکستان کا سفیر بنا دیا گیا۔

تہمینہ ایوب بتاتی ہیں کہ وہ بہت تعلیم یافتہ تھیں اور مختلف موضوعات پر ان کی اچھی گرفت تھی۔ رعنا لیاقت علی نے سفارت کاری کے اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیے۔ ہالینڈ نے انھیں اپنے سب سے بڑے اعزاز اورینج ایوارڈ سے بھی نوازا۔

اس وقت ہالینڈ کی رانی سے ان کی اچھی دوستی ہوئی اور رانی نے انھیں ایک عالیشان گھر کی پیشکش کرتے ہوئے کہا کہ تم انتہائی سستے دام میں اسے اپنی ایمبیسی کے لیے خرید لو۔

یہ گھر شہر کے درمیان میں اور شاہی محل سے صرف ایک کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ وہ بلڈنگ آج بھی پاکستان کے پاس ہے جہاں ہالینڈ میں پاکستان کا سفارتی عملہ رہتا ہے۔

بیگم رعنا سوئزرلینڈ کی سفیر بھی بنیں اور انڈیا کے سابق خارجہ سیکریٹری جگت مہتہ کے فلیٹ میں ٹھہریں جو اس وقت سوئزرلینڈ میں انڈیا کے جونیئر سفیر ہوا کرتے تھے۔

بعد میں جگت مہتہ نے اپنی کتاب نیگوشی ایٹنگ فار انڈیا، ریزالونگ پرابلمز تھرو ڈپلومیسی میں لکھا کہ وہ ہمارے چھوٹے سے فلیٹ میں اپنے دو بچوں کے ساتھ رہیں حالانکہ وہاں برطانوی سفیر نے جو پاکستان کے سفیر کی ذمہ داری بھی سنبھالتے تھے انھیں اپنے گھر رہنے کی دعوت دی تھی۔

انھوں نے لکھا کہ آتے ہی وہ بغیر تکلف کے میرے باورچی خانے میں گئیں اور تو اور ایک مرتبہ انھوں نے میرے دو چھوٹے بچوں کو نہلایا بھی تھا۔ ڈپلومیسی کی تاریخ میں انڈیا اور پاکستان کے سفیروں کے درمیان اس طرح کی دوستی کی شاید ہی کوئی مثال ملتی ہو۔

رعنا کا ایوب سے ٹکراؤ

ڈپلومیسی کے شعبے میں کافی کامیاب ہونے کے باوجود بھی پاکستان کے صدر ایوب خان کے ساتھ ان کے تعلقات کبھی بہتر نہیں ہوئے اور ایوب خان نے انھیں تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

تہمینہ عزیز لکھتی ہیں کہ ایوب خان چاہتے تھے کہ وہ فاطمہ جناح کے خلاف انتخابی مہم میں حصہ لیں لیکن رعنا نے صاف انکار کر دیا ان کا کہنا تھا کہ وہ پاکستانی سفیر ہیں۔

جنرل ضیا سے ٹکراؤ

بیگم رعنا لیاقت علی کو ان کی خدمات کے لیے پاکستان کے سب سے بڑے شہری اعزاز نشانِ امتیاز سے نوازا گیا انھیں مادرِ پاکستان کا خطاب بھی ملا۔

تہمینہ بتاتی ہیں کہ جب جنرل ضیا الحق نے بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا تو انھوں نے فوجی حکومت کے خلاف احتجاج کی قیادت کی اور جنرل ضیا الحق کے اسلامی قوانین کی پرزور مخالفت کی۔

30 جون 1990 کو رعنا لیاقت علی نے آخری سانس لی۔

1947 کے بعد پاکستان کو اپنا گھر بنانے والی رعنا لیاقت علی تین بار انڈیا آئیں لیکن ایک بار بھی الموڑہ واپس نہیں گئیں لیکن الموڑہ کو بھلا بھی نہیں پائیں۔ دیپا اگروال کہتی ہیں کہ وہ الموڑہ کے روایتی کھانے پسند کرتی تھیں اور ایک بار اپنے بھائی نارمن کو ان کی سالگرہ پر خط میں لکھا تھا' آئی مس الموڑہ۔

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل

ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان ہے۔ ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

''قادیانی مسئلہ اور ٹرمپ''

تحریر ابن شاہد/مبشر شاہد

روزنامہ اوصاف لاہور نے اپنے 3 اگست 2019ء کے شمارہ میں جناب زاہد الراشدی صاحب کا ایک کالم ''قادیانی مسئلہ اور صدر ٹرمپ'' کے عنوان سے ایک کالم شائع کیا ہے۔ جناب زاہد الراشدی صاحب ایک ایسی مذہبی شخصیت ہیں جن کا صحافت کے ساتھ پرانا تعلق ہے اور وہ اکثر ان معاملات پر خامہ فرسائی فرماتے رہتے ہیں۔

کالم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ

''چند روز قبل امریکہ کے صدر ٹرمپ کے ساتھ ایک قادیانی وفد کی ملاقات کی خبر سے قادیانی مسئلہ ایک نیا رُخ اختیار کر گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ قادیانی وفد نے امریکی وفد سے شکایت کی ہے کہ پاکستان میں انہیں مسلمان تسلیم نہیں کیا جاتا ہے اس کے جواب میں صدر امریکہ نے کیا کہا اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا''۔

حیرت ہے کہ مولانا نے یا تو سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والی اس ویڈیو کو دیکھا نہیں یا جان بوجھ کر ابہام پیدا فرمایا ہے۔

اس لئے قبل اس کے موصوف کے ''ارشادات'' کے متعلق اپنا نقطہ نظر واضح کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا واقعہ کی مختصر تفصیل بیان کی جائے۔

گذشتہ دو سالوں سے امریکن سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے مذہبی ہم آہنگی کو اُجاگر کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی جاتی ہے جس میں مقالہ جات پڑھے جاتے ہیں۔ مکالمے ہوتے ہیں اور اس امر کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ مذہبی منافرت کو کیسے کم کیا جائے اور بھائی چارہ کو کس طرح فروغ دیا جائے۔

اس سال جولائی کے اوائل میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں ا مسال مختلف ممالک سے 1000 کے قریب مندوبین شریک ہوئے۔ نیز اس کانفرنس میں دنیا بھر سے 24 ممالک کے 27 ایسے لوگ جو مذہبی انتہا پسندی کا نشانہ بنے تھے ان کو مدعو کیا گیا اور یہ مختلف مذاہب اور مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں عیسائی، بدھ، یزیدی، یہودی اور مسلمان سبھی شامل تھے۔ اور میانمر، ویت نام، نارتھ کوریا، ایران، ترکی، کیوبا، ایری ٹیریا، نائیجیریا، سوڈان، یمن، جرمنی اور عراق کے باشندے تھے۔ ان میں ڈاکٹر فرید احمد بھی شامل تھے جو خود کرائسٹ چرچ میں ہونے والے حملہ میں زخمی ہوئے اور ان کی اہلیہ شہید ہو گئیں۔

اس کانفرنس کے دوران ان تمام افراد کی صدر امریکہ ڈونلڈ ٹرمپ سے ملاقات کروائی گئی اور تمام افراد نے اپنا اپنا تعارف کروایا۔ اس موقع پر پاکستان سے مدعو کئے جانے والے احمدی عبدالشکور صاحب بھی موجود تھے جنہیں اس کانفرنس کے منتظمین نے خود چنا اور بلوایا اور سفر کے انتظامات کئے۔ اس موقعہ پر صرف شکور صاحب ہی نہیں ہر رُکن سے جو گفتگو ہوئی وہ ریکارڈ ہوئی اور نشر بھی کی گئی۔

شکور صاحب نے ''اُردو'' میں اپنے بارہ میں جو تعارف پیش کیا وہ مختصراً اس طرح ہے کہ میں احمدی کمیونٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہمیں 1974ء میں پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔ ہمارے گھروں اور دوکانوں کو لوٹا گیا۔ میں اپنے بچوں کو لے کر ربوہ منتقل ہو گیا۔ مجھے جماعت کتب فروخت کرنے پر پانچ سال قید اور چھ لاکھ روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ (لاہور ہائی کورٹ کی طرف سے احکامات کے بعد) سوا تین سال بعد رہا ہوا۔ مَیں امریکہ میں اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتا ہوں مگر پاکستان میں نہیں۔ اگر کہوں گا تو سزا دی جاتی ہے۔ ہم پُرامن کمیونٹی ہیں ہم گالیوں اور بدزبانی کے جواب میں کسی کو کچھ نہیں کہتے اور اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑتے ہیں۔

اس کا ترجمہ جناب شان تاثیر صاحب نے ساتھ ساتھ کیا۔

پھر اس کے بعد تمام تعارف کے جواب میں امریکی صدر ٹرمپ نے جو کہا وہ بھی اسی ویڈیو میں موجود ہے۔ زاہد الراشدی صاحب اگر اس ویڈیو کو ملاحظہ فرما لیتے تو انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی کہ قادیانی امریکن صدر کے پاس شکایت لے کر گئے ہیں اور پتہ نہیں ٹرمپ نے کیا کہا ہے اس گفتگو میں شکور صاحب سے پہلے تمام شاملین اپنے اپنے خیالات سے صدر ٹرمپ کو مطلع کر چکے تھے۔ شکور صاحب نے جو گفتگو کی، کیا مولانا موصوف اس میں سے کسی بات کی تردید کر سکتے ہیں؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔

مولانا راشدی صاحب کی اس بات سے دنیا کا ہر ذی شعور اتفاق کرے گا کہ صدر ٹرمپ چھوڑ، دنیا کا کوئی بھی حکمران بلکہ حکمرانوں کا مجموعہ اور اقوام متحدہ بھی کسی

دنیا کے ملک میں کسی فرد یا گروہ کو مسلمان یا غیر مسلم قرار دینے کی اتھارٹی نہیں رکھتا۔ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور ہر فرد کا حق ہے کہ وہ جو اپنے آپ کو سمجھے اس کا اعلان کرے اور کسی بھی شخص کا یہ حق ہے کہ وہ دوسرے کو جو چاہے سمجھے۔ لیکن یہ حق تو کسی مہذب معاشرے میں بہر حال کسی کو نہیں دیا جاتا کہ دوسرا فرد اس کے سمجھ کے مطابق اپنے آپ کو بھی سمجھے۔

اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

مسلماں تو وہ ہے جو ہے علم باری میں
کروڑوں یوں تو لکھے ہیں مردم شماری میں

یہاں یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ کوئی قادیانی وفد صدر ٹرمپ کو ملنے نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس ضمن میں کوئی شکایت کرنے گیا تھا۔ شکور صاحب نہ تو کوئی جماعت کے عہدیدار ہیں اور نہ ہی جماعت کی نمائندگی میں وہاں گئے تھے۔

محض اپنی بات کی قیمت بڑھانے کیلئے راشدی صاحب نے جان بوجھ کر مغالطہ پیش کیا ہے اور پھر شکور صاحب تو صاف کہہ رہے ہیں اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ وہ یہ معاملہ خدا پر چھوڑتے ہیں۔ ٹرمپ سے کوئی شکایت کی نہ درخواست کی اور نہ ہی کوئی مدد طلب کی۔

اگر راشدی صاحب، صدر ٹرمپ کو خدا سمجھتے ہیں جن پر شکور صاحب نے معاملہ چھوڑا ہے تو یہ راشدی صاحب کا اپنا معاملہ ہے۔۔۔۔!

راشدی صاحب نے اپنے کالم میں مورمن فرقہ کی مثال پیش کی ہے اور شیخی بگاڑتے ہوئے اپنے ایک نشریاتی پروگرام کا حوالہ دیا ہے کہ کس طرح انہوں نے یہ مثال پیش کر کے ایک مسیحی مذہبی رہنما کو خاموش کر دیا۔

میرے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے قلم اور زبان سے یہ مثال پیش کروا کے ان کے اپنے دلائل کی نفی کروائی ہے۔ کیا راشدی صاحب بتائیں گے کہ مورمن فرقہ کو کس ملک نے یا خاص طور پر امریکہ نے حکومتی، عدالتی سطح پر غیر عیسائی اقلیت قرار دے کر ان کے عیسائی ہونے کا ٹائٹل یا ان کے مذہبی اعتقادات یا ان کی تبلیغ پر پابندی لگائی ہے؟ کتنے مورمنز پر بائبل پڑھنے پر مقدمات ہوئے ہیں؟ کتنوں کو اپنے عیسائی کہنے پر قید کی سزائیں دی گئیں؟ کوئی اگر انہیں عیسائی نہیں سمجھتا نہ سمجھے مگر ریاست نے اس کام میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ یہ اعزاز دنیا بھر میں پاکستان کو ہی حاصل ہوا ہے۔ اس لئے یہ دلیل کہ عیسائیوں کا کوئی گروہ دوسرے کو سچا عیسائی نہیں سمجھتا ہرگز قابل اعتنا نہیں۔

ویسے راشدی صاحب کو یہ بھی اچھی طرح یاد ہوگا کہ مسلمانوں میں سے ہر فرقہ اپنے سوا دوسروں کو کیا سمجھتا ہے اور اپنے فتاویٰ میں ان کو کن کن الفاظ میں یاد کرتا ہے اس باب میں تو کتابیں بھری پڑی ہیں۔

رہ گئی بات کہ پارلیمنٹ، عدالت عظمیٰ، مذہبی قیادت اور سول سوسائٹی کے عناصر اربعہ یعنی اکثریت کسی کی سماجی حیثیت کا فیصلہ کرے۔ عدالت سول سوسائٹی۔ وغیرہ

بدقسمتی سے مذہبی قیادت خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہو جب بھی کسی کی سماجی حیثیت کا فیصلہ کرتی رہی، تاریخ ان کے اثرات کو ہمیشہ منفی نظر سے دیکھتی رہی ہے۔ خود یورپ میں کٹر مذہبی قیادت کے نظریات کی بدولت جو گھٹن پیدا ہوئی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا، اسے تاریخ میں کس نام سے یاد کیا جاتا ہے؟

خود وطن عزیز میں یہی مذہبی قیادت تھی جس نے قیام پاکستان سے ہی یہ روش جاری کر دی اور نتیجتاً پاکستان کی تاریخ کا پہلا مارشل لاء (خواہ وہ جزوی ہی تھا) انہی علماء کے پیدا کردہ فساد کے نتیجہ میں لگا اور قوم آج تک اس کے اثرات سے نکل نہیں سکی۔ اکثریت کے بل بوتے پر مذہبی فیصلے کرنے کی ذہنیت نے جو گل کھلائے ہیں اس کا ذکر قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یہ انکشاف شاید بہت سے قارئین کے لئے نیا ہو کہ پاکستانی عدلیہ نے اس غیر فطری روش کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ہولناکیوں کا پون صدی قبل ہی اندازہ لگا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جزاء دے فسادات 1953ء کی عدالتی انکوائری کمیٹی کو جس نے اس معاملہ کو بھانپا اور علمائے کرام کو اس طرف توجہ بھی دلائی۔ فاضل جج صاحبان اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں:

''اگر پاکستان کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے دستور کی بنیاد مذہب پر رکھے تو یہی حق ان ملکوں کو بھی دینا ہوگا جن میں مسلمان کافی بڑی اقلیت پر مشتمل ہیں یا جو کسی ایسے ملک میں غالب اکثریت رکھتے ہیں جن میں حاکمیت کسی غیر مسلم قوم کو حاصل ہے لہذا ہم نے مختلف علماء سے یہ سوال کیا کہ اگر پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ شہریت کے معاملات سے مسلموں سے مختلف سلوک کیا جائے تو کیا علماء کو اس امر پر کوئی اعتراض ہوگا کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے''۔

یہ سوالات فاضل جج صاحبان نے مختلف ''علماء'' مذہبی قیادت سے کئے ان میں سے دو جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

عالم نمبر 1 مولوی ابوالحسنات قادری

سوال: کیا آپ ہندوؤں کا جو ہندوستان میں اکثریت رکھتے ہیں یہ حق تسلیم کریں گے کہ وہ اپنے ہاں ہندو دھرم کے ماتحت مملکت قائم کر لیں؟

جواب: ہاں

سوال: اگر اس نظام حکومت میں منوشاستر کے ماتحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سلوک کیا جائے تو کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟

جواب: جی نہیں۔

عالم نمبر 2 مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

سوال: اگر ہم پاکستان میں اس شکل کی اسلامی حکومت قائم کرلیں تو کیا آپ ہندوؤں کو اجازت دیں گے کہ وہ اپنے دستور کی بنیاد اپنے مذہب پر رکھیں؟

جواب: یقیناً مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیئے جائیں۔

رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء صفحہ 354 ناشر نیاز مانہ پبلیکیشنز لاہور)

اور اس قسم کے جوابات دوسرے علماء نے بھی دیئے۔

قارئین آپ نے ملاحظہ کیا ''مذہبی قیادت'' نے کس بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ ہندوستان اور دیگر ممالک میں بسنے والے اُمت محمدیہ کے نہتے، معصوم اور بے بس مظلوم افراد کے لئے ان کی حکومتوں کے ہاتھ میں قتل وغارت کا کھلا لائسنس دیدیا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی شہ اسی ''مذہبی قیادت'' نے سرکاری طور پر دے دی تھی تو کیا غلط ہوگا۔ اب کس منہ سے ہندوستان اور فلسطین اور کشمیر کے مظلوموں کا مقدمہ لے کر دنیا میں جائیں گے۔

پھر اکثریت ہی کے بل بوتے پر فرانس، ہالینڈ، امریکہ، سوئٹزرلینڈ اور دیگر ممالک کی ''پارلیمنٹ''، ''عدلیہ''، ''مذہبی قیادت'' اور ''سول سوسائٹی'' آئے دن مسلم مخالف اقدامات مثلاً نقاب اور برقع پر پابندی، مینار بنانے پر پابندی وغیرہ جیسے معاملات اُٹھا رہی ہے تو ان کے ہاتھوں میں یہ خنجر کس نے تھمایا تھا جس سے اب تک لہو ٹپک رہا ہے۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں

لہٰذا میری گزارش ہے کہ اب قوم کو اپنی فساد انگیز تحریروں سے گمراہ نہ کیجئے۔ آپ کو یاد ہونا چاہیے کہ میثاق مدینہ اور اقوام متحدہ کے چارٹر جس پر پاکستان دستخط کر چکا ہے کے مطابق اخلاقی، مذہبی، قانونی اور شرعی طور پر پابند ہیں کہ ہر فرد کی آزادی کو یقینی بنانا ہوگا۔

☆☆☆☆

خوشخبری

معزز قارئین! خدا تعالیٰ کے فضل وکرم کے ساتھ عباسی اکیڈمی لندن کے زیر اہتمام رسالہ ''آبگینے'' خواتین ڈائجسٹ جولائی 2019ء سے جاری کیا گیا ہے۔

صنفِ نازک کا یہ رسالہ تمام مکاتب فکر کے لئے مذہب اور رنگ ونسل سے پاک ہے۔ اس کا اصل مقصد دنیا میں خواتین کا وہ مقام ومرتبہ جو اسلام نے دیا ہے اس کو ملے اور نئی نسل کو اچھے اخلاق میسر ہوں جس سے معاشرہ کو پُر امن بنایا جائے۔ ہماری کوشش ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ دنیائے صحافت میں اس کو اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

''آبگینے'' خواتین ڈائجسٹ ایک معیاری علمی وادبی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا مجلہ ہے جو علم وادب کی ترویج وترقی اور خواتین کی اردو ادب سے دلچسپی کو بڑھانے اور ان کی کاوشوں کو آپ تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ لندن سے جاری کردہ اس رسالہ میں خواتین کے کلام اور تحریرات کو شامل کیا جاتا ہے تاکہ خواتین کے افکار اور صلاحیتوں کو تحریرات کی شکل میں آپ کے سامنے لایا جاسکے۔

آبگینے آج کی خاتون کے زاویہ سوچ کو صحیفہ قرطاس پر بکھر کر رنگ رنگ کے پھول کھلا رہا ہے جس کے نتیجے میں اس ادبی گلدستہ کی مہک سے قارئین کے ذہن ودل معطر ہو رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو اس طور سے برکت دے کہ یہ رسالہ اس جرم سماوی (علم ودانش کی روشنی) کا سارنگ اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ اس سے تمام دنیا میں آسمانی نور پہنچائے۔ آمین

علاوہ ازیں ستمبر 2019ء سے اس کی نئی ویب سائٹ بھی تشکیل دی گئی ہے جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے جس سے قارئین بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

www.aabgeenei.com

آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں رسالہ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کے لئے ''ادارہ'' پُرعزم ہے۔

مدثرہ عباسی

مدیرہ آبگینے

شیر سندھ ''میر شیر محمد تالپور''

تحریر مرزا کاظم رضا بیگ

17 فروری 1843 کی منحوس شام ڈھل چکی تھی، اپنوں کی غداری اور بزدلی کی وجہ سے حیدرآباد اور خیرپور کے میروں کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ سر چارلس نیپیر فتح کی خوشی میں اپنے خون آلود ہونٹ چاٹ رہا تھا کہ شیر جیسی گرج نے اسے دہلا دیا۔ میرپور خاص کے مانکانی تالپوروں کی حکومت کا پھریرا ابھی لہرا رہا تھا۔ ابھی میر شیر محمد خان تالپور زندہ تھے۔ انگریزوں کو ابھی ایک اور جنگ لڑنا تھی، ایک اور معرکہ سر کرنا تھا۔ میانی کی جنگ انگریز فوج نے اس لیے جیت لی تھی کہ حیدرآباد اور خیرپور کے حکمران عوام سے بہت دور رہتے تھے اور انہوں نے اپنا اقتدار بچانے کے لیے آخری وقت میں انگریزوں کی دوستی کا دم بھرا تھا۔ برٹش سامراج، سندھ کے سینے میں مسلسل چھرا گھونپ رہا تھا لیکن حیدرآباد کا والی انگریزوں سے دوستی کے امکانات نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میانی کی جنگ میر نصیر خان کی شدید ترین خواہش کے باوجود نہ ٹل سکی۔ جب میر شیر محمد خان تالپور کو میانی کی جنگ کا علم ہوا تو وہ حیدرآباد کے حکمران کی مدد کے لیے دوڑا لیکن اسے تالپور حکمران کی شکست کی اطلاع ملی۔ کہا جاتا ہے کہ میر شیر محمد خان حیدرآباد پر انگریزوں کے قبضے کے بعد ٹنڈو الہ یار سے آگے بڑھ کر انگریزوں کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا لیکن اسے، اس اقدام سے روک دیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ فی الحال واپس چلا جائے۔

ایک روایت کے مطابق میر شیر محمد خان کے جنگی مشیروں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس وقت لڑنا مناسب نہیں ہے۔ اس روایت کے برعکس نامور سندھی محقق، مرزا عباس علی بیگ اپنے مضمون ''دبی جی جنگ'' میں رقم طراز ہیں کہ ''میجر آٹو رام نے کوئی حیلہ بہانہ کر کے انہیں وہاں سے لوٹنے پر مجبور کر دیا''۔ میر حاجی محمد بخش خان تالپور کے بیان سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ انگریزوں نے چالبازی سے کام لیتے ہوئے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے میر شیر محمد خان کو واپسی پر مجبور کیا۔ لیکن انہوں نے اس سلسلے میں ایک بالکل ہی مختلف واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''چارلس نیپیر نے میر صوبیدار خان تالپور کو لالچ دیتے ہوئے کہا کہ سندھ کے خطے میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں حکومت تمہارے حوالے کر کے بمبئی لوٹ جاؤں گا، تم جس طرح سے بھی ہو سکے، شیر محمد خان کی حیدرآباد کی جانب قدمی رکواؤ۔ میر صوبیدار خان، قرآن پاک ساتھ لے کر ٹنڈو الہ یار پہنچا اور میر شیر محمد خان کو قرآن پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ انگریز سپہ سالار، حکومت اس کے حوالے کر کے سندھ سے جا رہا ہے، اگر بغیر لڑے ملک ہمارے پاس رہے تو جنگ نہیں کرنا چاہئے۔ میر شیر محمد خان کو بخوبی علم تھا کہ میر صوبیدار خان غلط بیانی کر رہا ہے لیکن قرآن کریم کا احترام کرتے ہوئے اس نے انگریزوں سے جنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے پیش قدمی روک دی۔ کچھ مبصرین کی رائے کے مطابق، اگر وہ اس وقت تھکی ہوئی انگریز سپاہ پر حملہ کر دیتے تو چارلس نیپیر کی شکست یقینی تھی۔

میر شیر محمد جب اپنی پیش قدمی روک کر واپس ہوا اور میر صوبیدار خان اپنے مشن کی کامیابی کے بعد اپنی کارگزاری کے بدلے انگریزوں سے مفادات حاصل کرنے کے لیے حیدرآباد واپس پہنچا تو انگریزوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ میر شیر محمد خان کو جب اس کا علم ہوا تو وہ فوراً انگریزوں سے جنگ کے لیے تیار ہو گیا، اس موقع پر ہوش محمد شیدی بھی شیر محمد تالپور کے پاس پہنچا اور اس کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ دوسری جانب میر صوبیدار خان خان کو گرفتار کرنے کے بعد چارلس نیپیر اپنی فوج کے ساتھ حیدرآباد سے چند میل کے فاصلے پر نایجن جی گوٹھ پہنچ گیا۔ میر شیر محمد خان جو اس دوران پیش قدمی کرتے ہوئے حیدرآباد سے بارہ میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوا تھا، اس نے نیپیر کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ گرفتار شدہ میروں کو رہا کر دے تو اسے سندھ چھوڑ کر واپس جانے کا راستہ دے دیا جائے گا۔ اس پیغام کا جواب انگریز سپہ سالار نے توپ کا گولا داغ کر دیا جس کے بعد دبی کے میدان میں دونوں افواج کا آمنا سامنا ہوا۔ اب تالپور حکمران، جنگ میانی کی بہ نسبت مختلف پوزیشن میں تھے۔ بلوچوں نے گیارہ توپوں کے ساتھ انگریز فوج پر حملہ کر دیا، انگریزی فوج نے بھی توپوں سے گولے برسا کر تالپور فوج کے بارود کے ذخیرے کو تباہ کر دیا، جس سے بے شمار سپاہی شہید ہو گئے۔ اس کے بعد نیپیر

نے پھلیلی کی طرف سے حملہ کیا لیکن اس محاذ پر اسے بلوچوں کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس ہزیمت سے غضب ناک ہو کر اس نے تالپور افواج پر مختلف اطراف سے حملہ کیا۔ ہوش محمد شیدی جس بہادری اور شجاعت سے لڑ رہا تھا، اس سے انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ یہ حبشی غلام، جو میروں کی فوج کا سپہ سالار تھا، دشمن پر قہر بن کر نازل ہوا۔ جب انگریز فوج کی شکست کے آثار نظر آنے لگے تو چارلس نیپیر نے عیاری اور مکاری سے کام لیتے ہوئے تالپور لشکر کے چند ضمیر فروش سپاہیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان غداروں نے بارود میں آگ لگا دی جس کی تباہی کے بعد تالپور سپاہ بے دست و پا ہو گئی۔ ہوش محمد شیدی کے سپاہیوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ تلوار اور نیزے سنبھال کر انگریزی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ ہوش محمد شیدی نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپ کر میر شیر محمد خان کو میدان جنگ سے دور جانے کا مشورہ دیا لیکن شیر محمد خان نے کہا کہ ''سندھ کا شیر، جنگ کا میدان چھوڑ کر بھاگ کر، مادر وطن کی مٹی کو شرمندہ کرے یہ مجھے گوارہ نہیں، برطانوی جرنیل کو میرا زندہ جسم نہیں بلکہ لاش ملے گی''۔ ہوش محمد شیدی نے دوبارہ اصرار کرتے ہوئے کہا کہ ''سرکار آپ سے سندھ کے عوام کی امیدیں وابستہ ہیں، جب تک آپ زندہ رہیں گے، سندھ دھرتی بھی زندہ رہے گی، اگر آپ نہیں رہیں گے تو سندھ کا ستارہ بھی غروب ہو جائے گا''۔ ہوشو شیدی کے شدید اصرار پر میر شیر محمد تالپور نے میدان جنگ سے کوچ کیا، جس کے بعد گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ انگریزی فوج اس دور کے جدید ہتھیاروں سے لیس تھی جب کہ بلوچ سپاہی روایتی اسلحے کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے۔ آخر کب تک لڑتے، ہوشو کی فوج کے تمام سپاہی شہید ہو گئے، ہوش محمد شیدی نے آخری سانس تک مقابلہ کیا، بالآخر اس نے بھی جام شہادت نوش کیا۔

مرزا عطا محمد شکارپوری نے اپنی تصنیف ''تازہ نوائے معارک'' میں لکھا ہے کہ ''جب انگریزوں نے میروں کو حیدرآباد میں قید کر لیا تو میر شیر محمد تالپور دبی میں ان کے خلاف خیمہ زن ہوا۔ پہلے ہوش محمد شیدی فوج کے ایک دستے کے ساتھ انگریز فوج کے ساتھ مقابلے پر آیا اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ پھر میر غلام علی ابن عبداللہ تالپور، رحیم خان تالپور، کمال خان مری، تین سو بلوچ سپاہیوں کے ساتھ انتہائی بہادری سے لڑے اور انگریزوں کا کافی نقصان کیا جس سے نیپیر سخت ہراساں ہوا اور اس نے سیاسی چالبازی سے کام لیتے ہوئے بلوچ لشکر کے سرکردہ افسروں، محمد خان ٹھوڑھو، میر محمد خان اور غلام محمد لغاری کو ساتھ ملا لیا۔ وہ عین لڑائی کے وقت میدان جنگ سے بھاگ گئے، نتیجتاً تالپور فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس سے قبل کہ ہم میر شیر محمد خان کی ان سرگرمیوں کا تذکرہ کریں جو انہوں نے ہوشو شیدی کے اصرار پر میدان جنگ چھوڑنے کے بعد شروع کی ہوئی تھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دبی کی جنگ میں تالپوروں کی شکست کے اسباب کا جائزہ لیا جائے، تاکہ ان کی ان غلطیوں کا علم ہو سکے جن کے باعث انگریز سندھ کے خطے میں قدم جمانے میں کامیاب ہوئے۔

اس سلسلے میں تالپور حکمران، میر نصیر خان کی عوام سے دوری اور سندھ کے میروں کا جنگ سے مسلسل گریز، میانی کی جنگ میں شکست کا سب سے بڑا سبب تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ میانی کی جنگ سے بہت پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی سندھ کے دو بڑے حصوں، حیدرآباد اور خیرپور میرس پر قابض ہو چکی تھی تو غلط نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں ہمیں ان تمام شرم ناک معاہدوں کو نہیں بھولنا چاہئے جو بعض سرداروں کے تعاون کی وجہ سے سندھیوں پر وقتاً فوقتاً ٹھونسے جاتے رہے۔ میانی کی جنگ میں دراصل انگریزوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا، جس میں کامیاب ہونے کے بعد انہوں نے سندھی قوم پر ظلم و بربریت، اور خطے میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا تھا۔ میرپور خاص کے حاکم میر شیر محمد تالپور نے انگریزوں کی بالادستی قبول نہیں کی جس کی وجہ سے دبی کی جنگ لڑی گئی جو مقامی سرداروں کے انگریزوں کی ایما پر غداری کے باعث تالپوروں کی شکست پر ختم ہوئی۔

سندھ کی ریاست کو چویاری نظام کے تحت تالپوروں کے تین خاندانوں نے آپس میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ممتاز سندھی مؤرخ، مولائی شیدائی اپنی تصنیف ''تاریخ، تمدن سندھ''، میں رقم طراز ہیں کہ میر علی مراد خان مانکانی او میر سہراب خان تالپور کے انتقال کے بعد تالپوروں کی آپس کی نااتفاقی نے انگریزوں کو سندھ پر قبضے کا سنہری موقع فراہم کیا۔ حیدرآباد اور خیرپور کے تالپور حکمرانوں نے انگریزوں کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے تمام علاقہ ان کی تحویل میں دے دیا۔ حیدرآباد کے میروں سے شیر سندھ کے اختلافات کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔ میر شیر محمد تالپور، میانی کی جنگ میں میر نصیر کی شکست کے بعد حیدرآباد کے میروں کی مدد کے لیے پہنچے تھے مگر انگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں، عیاری اور مکاری کی وجہ سے انہیں راستے سے ہی واپس لوٹنا پڑا۔

جنگ دبی کی شکست کا ایک اور بڑا سبب تالپور فوج میں شامل بعض سرداروں کی

غداری تھی جنہوں نے اپنے کارندوں کے ذریعے بارود کے ذخیرے کو نذر آتش کروا کے اپنی ہی فوج کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ دوسری جانب سندھی فوج کسی ایک سپہ سالار کی ماتحتی میں نہ تھی بلکہ سپاہی اپنے اپنے قبیلے کے سرداروں کے احکامات کے پابند تھے۔ تالپوروں کو نومڑیوں، جوکھیوں، کلمتیوں اور چانڈیو نے عین میدان جنگ میں ساتھ چھوڑ دیا۔ مولائی شیدائی نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ ''دبی کی جنگ میں تالپوروں کی شکست کے خطرے کو بھانپ کر بعض سرداروں کے مشورے پر شیر محمد تالپور، ہوش محمد شیدی کو فوج کی باگ ڈور سونپ کر میدان جنگ سے چلے گئے تھے جس کے بعد بلوچ سردار، ایک شیدی غلام کے زیر کمان لڑنا اپنی توہین سمجھ رہے تھے۔ ہوش محمد شیدی نے کئی بار پیغامات بھیج کر میدان جنگ کے آس پاس مقیم بلوچ سرداروں کو انگریزوں سے جنگ کی درخواست کی لیکن انہوں نے لڑائی سے علیحدگی اختیار کیے رکھی۔ ہوشو شیدی کی شہادت کے بعد انگریزوں نے مذکورہ قبائل پر بھی حملہ کر کے سخت تباہی مچائی، جس کے بعد وہ مختلف علاقوں کی جانب فرار ہو گئے۔

دوسری جانب میر شیر محمد تالپور دبی کے میدان جنگ سے نکل کر میر پور خاص پہنچے اور عمر کوٹ کے قلعہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کے وفادار سپاہی بھی میدان جنگ میں شکست کھانے کے بعد عمر کوٹ کے قلعہ میں پناہ گزین ہوئے۔ اس کے کچھ عرصے بعد انگریزوں نے اپنی قوت مجتمع کر کے، عمر کوٹ پر حملہ کر کے قلعہ پر یورش کی۔ تالپور فوج کے بچے کھچے سپاہوں نے ایک ہفتے تک انگریز فوج کا مقابلہ کیا بالآخر شکست کھا گئے اور قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ میر شیر محمد تالپور، عمر کوٹ سے فرار ہو کر تھر پارکر میں نوکوٹ کے قلعہ میں منتقل ہو گئے۔ وہاں پر اپنی فوج کو منظم کیا اور دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ شہداد پور کے مقام پر انگریزوں کے مقابلے پر آئے لیکن اپنے ایک وفادار ملازم کی غداری کی وجہ سے وہاں سے بھی پسپائی اختیار کرنا پڑی جس کے بعد وہ سکرنڈ چلے گئے۔ انگریزی فوج نے ان کا پیچھا کیا، ہالا شہر کے قریب ایک نہر کے کنارے، جنرل جان جیکب اور جنرل رابرٹسن کی قیادت میں انگریزوں کی منظم فوج سے ان کا مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں ان کے سپاہی انتہائی بہادری سے لڑے لیکن یہاں بھی انگریزوں نے چالبازی کی سیاست سے تالپور فوج کے چند سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور انہیں شکست ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے انگریزوں کے ساتھ طویل عرصے تک چھاپہ مار جنگ لڑی لیکن مسلسل ناکاموں کے بعد انہوں نے سندھ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا اور کسی نامعلوم مقام پر روپوش ہو گئے۔

قارئین کے لئے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور نے قارئین کے لئے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے ''ادارہ'' پُرعزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدر دانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد ''ہفتہ وار'' کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

”بلوچستان کے خلائی سائنسدان ڈاکٹر یار جان عبدالصمد کی کہانی“

تحریر محمد زبیر خان

پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے پسماندہ ضلع کیچ کے دور دراز گاؤں بلیدہ کے رہائشیوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ان کے علاقے کے ایک متوسط طبقے کے زمیندار کا بیٹا خلائی ٹیکنالوجی پر کام کرنے والا سائنسدان اور برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے کم عمر سینیئر ریسرچ سائنسدان اور فیلو ہونے کا اعزاز حاصل کرنے والا ہے۔

ڈاکٹر یار جان عبدالصمد کو کیمبرج یونیورسٹی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے کم عمر سینیئر ریسرچ سائنسدان ہونے کا اعزاز حاصل ہے

ڈاکٹر یار جان عبدالصمد نے صحافی محمد زبیر خان کو اس منزل تک پہنچنے کی کہانی سنائی ہے جو ان ہی کی زبانی پیش خدمت ہے۔

میرا تعلق ایک ایسے علاقے سے ہے جہاں پر تعلیم کا کوئی زیادہ رواج نہیں تھا بلکہ پورے علاقے میں گنتی ہی کے چند لوگ ہوں گے جو خط وغیرہ پڑھ سکتے ہوں گے۔

میرے والد اور والدہ نے کبھی سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا، مگر بچپن ہی سے ان کی خواہش تھی کہ ہم پڑھ لکھ جائیں۔ ہم زمیندار ضرور ہیں اور زمینیں بھی کافی ہیں مگر ہماری زمینوں پر وہ پیداوار نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔

چنانچہ والدہ میری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کیا کیا کرتی تھیں، بیان نہیں کرسکتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ والد صاحب کو اقبال کے کچھ اشعار یاد تھے جو وہ مجھے اور میرے بھائیوں کو ہر وقت سنایا کرتے تھے جس سے ہمت بندھ جاتی تھی۔

پڑھائی میں میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے والد صاحب ہمیں ساتھ لے کر کراچی کے علاقے لیاری پہنچ گئے۔

جب میں پہلی مرتبہ کراچی گیا تو یقین کریں کہ مجھے ایسے لگا کہ یہ کوئی اور ہی دنیا ہے۔ لوگ، گاڑیاں، ٹریفک اور روشنیاں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ رات کے وقت جلتی لائٹیں دیکھ کر مجھے ایسے لگا کہ جیسے میں کسی روشنیوں کے شہر میں پہنچ گیا ہوں۔

’جاؤ اپنے والد کے ساتھ زمینوں پر کام کرو‘

لیاری میں ایک اردو میڈیم سکول میں داخلہ لیا مگر جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ جب تک انگریزی اچھی نہیں ہوگی اس وقت تک ترقی کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس صورتحال کا اندازہ ہونے کے بعد والد صاحب کو بتایا کہ مجھے انگلش میڈیم سکول میں داخلہ لینا ہے، جس پر والد صاحب مجھے کلفٹن کراچی میں واقع شہرت یافتہ سکول لے گئے جو کہ ان کی استطاعت سے بڑھ کر تھا لیکن انھوں نے میرے شوق کی خاطر مجھے وہاں پڑھانے کی ٹھان لی تھی۔

میں ایک دیہاتی بچہ تھا جو شہری طریقے تو زیادہ نہیں جانتا تھا، مگر میرے پاس والدین کا دیا ہوا اعتماد اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ تھا۔ اس موقع پر پرنسپل صاحبہ نے اپنے دفتر میں والد صاحب کی موجودگی میں میرا انٹرویو لیا اور انگریزی ہی میں مجھ سے بات چیت شروع کردی، حالانکہ والد صاحب نے پرنسپل کو پہلے بتایا تھا کہ یہ یہاں داخلہ لینا ہی اس لیے چاہتا ہے کہ اس کی انگریزی بہتر ہوسکے۔ صورتحال یہ تھی کہ انگریزی تو مجھے آتی نہیں تھی مگر سمجھ لیتا تھا۔

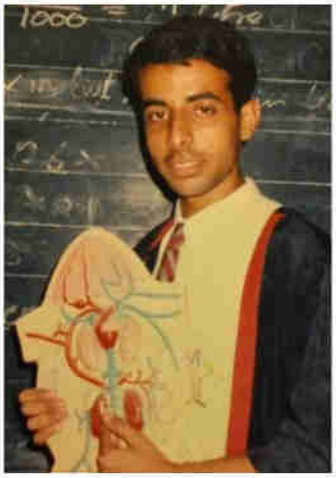

سب سے پہلے انگریزی میں میرا نام پوچھا جس کا میں نے اردو میں جواب دیا۔ اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ والد صاحب کیا کرتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ زمینوں پر کام کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے کچھ اور سوال پوچھے جس میں سے کچھ سمجھ میں آئے اور کچھ نہیں۔

شاید ان کو اردو میں میرے جواب ناگوار گزرے حالانکہ میں نے ان کو یہ بتانے کی بھی کوشش کی تھی کہ اگر مجھے داخلہ مل گیا تو میں بہت محنت کروں گا۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے آخر میں مجھے کہا 'بہتر یہ ہوگا کہ تم گاؤں جاؤ اور اپنے والد صاحب کے ساتھ زمینوں پر مدد کرو'

یہ ایسے الفاظ تھے جن کو سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جبکہ والد صاحب مجھ سے نظریں چرا رہے تھے۔ میں اس وقت ساتویں کلاس کا طالب علم تھا۔ میرا دل ٹوٹ سا گیا۔ مگر میری تو تربیت ہی کچھ اور طرح ہوئی تھی۔ مجھے تو حوصلے اور عزم کا سبق سکھایا گیا تھا۔

یہ بات تو ذہن نشین ہوگئی تھی کہ انگریزی سیکھنا لازم ہے۔ لیاری ہی میں ایک انگلش میڈیم سکول کے بینرز اور پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ مجھے اس سکول میں داخل کروا دیں۔

انگریزی سیکھنے کے لیے میں نے خود ہی کوشش کی، کبھی انگریزی اخبار مل جاتا تو وہ پڑھتا، کبھی گرامر کی کوئی کتاب پڑھ لیتا۔ ساتھ میں سکول کے اساتذہ سے جو مدد مل جاتی اس سے پڑھائی بھی کر لیتا تھا۔ گو کہ یہ ایک چھوٹا اسکول تھا لیکن کچھ اساتذہ انتہائی محنت سے پڑھایا کرتے تھے۔

جب میٹرک کے امتحان تھے تو لوگوں نے مجھے بھی نقل کرنے کی ترغیب دی مگر میں نے انکار کر دیا کہ مجھے اپنی محنت کا پھل چاہیے اور محنت کا پھل ضائع نہیں ہوتا۔ یہی میری والدہ کی بھی مجھ کو نصیحت تھی اور ہوا بھی یہی۔ میٹرک کا جب نتیجہ آیا تو میرا اے ون گریڈ آیا تھا۔

مسائل کا دور ختم، کامیابیوں کا سفر شروع

میں نے میٹرک سنہ 2003 میں کیا تھا جبکہ اسی سال کے آخر میں ڈی جی سائنس کالج کراچی میں داخلہ لینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ مایہ ناز سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی اس کالج کے طالب علم رہے تھے۔

ایف ایس سی کے دوران میں ٹیوشن بھی پڑھاتا رہا کیونکہ ظاہر ہے والدین پر اتنا بوجھ نہیں ڈال سکتا تھا لیکن اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے درس و تدریس اور تحقیق سے دلچسپی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ اگر میں پڑھاؤں گا تو زیادہ سیکھوں گا اور ہوا بھی یوں ہی۔

ایف ایس سی کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور جب نتیجہ آیا تو یہاں پر بھی میں نے اے ون گریڈ حاصل کیا۔

ایف ایس سی کے بعد خیبر پختونخوا کے شہر صوابی میں غلام اسحاق خان انسٹیٹیوٹ آف انجینیئرنگ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں داخلے کے لیے انٹری ٹیسٹ دیا۔ تیاری پوری تھی، چنانچہ انٹری ٹیسٹ شاندار طریقے سے پاس کیا اور اسکالرشپ ملی۔

میرے بھائیوں نے تعلیم کو عملاً خیرباد کہہ دیا تھا۔ وہ چھوٹے موٹے کاروبار کر رہے تھے جس سے وہ ہر ماہ مجھے معقول سی رقم بھیج دیتے تھے۔ یہ رقم مجھ جیسے طالب علم کے لئے جس کی ساری توجہ تعلیم پر تھی کافی تھی جبکہ یونیورسٹی کی تعلیم تو تھی ہی اسکالرشپ پر۔

مطلب یہ کہ ساتویں کلاس میں کراچی آنے کے بعد جو مسائل شروع ہوئے تھے وہ ایف ایس سی کرنے اور یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد ختم ہو چکے تھے اور کامیابیوں کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

آج اگر میں تحقیق سے وابستہ ہوں تو درحقیقت یہ مجھے غلام اسحٰق خان انسٹیٹیوٹ میں پروفیسر فضل احمد خالد (ستارہ امتیاز) کی ترغیب اور حوصلہ افزائی تھی کہ میں نے یونیورسٹی ہی میں فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے تحقیق سے وابستہ ہونا ہے۔

یونیورسٹی سے میں 2009 میں فارغ ہوا اور اسی سال اینگرو پولیمر اینڈ کیمیکل کراچی میں ملازمت شروع کر دی۔ ایک سال تک ملازمت کرتا رہا۔ اس دوران تحقیق اور اعلیٰ تعلیم کے مختلف اسکالرشپ پروگرامز اور اداروں سے رابطے کرتا رہا، جس کے بعد مجھے جاپان، کوریا، کینیڈا، جرمنی، امریکہ اور ابوظہبی سے اسکالرشپ کی آفر ہوئی۔

ایم فل اور ریسرچ کرنے کے لیے سب سے بہترین آفر خلیفہ یونیورسٹی ابوظہبی سے ملی کیونکہ اس کے ساتھ امریکہ کی ایم آئی ٹی یونیورسٹی کا بھی تعاون تھا۔ دوسری بات یہ کہ ریسرچ کے دوران ان کا اعزاز یہ ایک اچھی تنخواہ جتنا تھا، جس کی وجہ سے میں نے اس کو قبول کر لیا تھا۔

اس کے بعد اسکالرشپ ہی پر یونیورسٹی آف ٹوکیو سمیت بہت سے عالمی اداروں میں ریسرچ کی اور پی ایچ ڈی مکمل کی۔

پی ایچ ڈی کے دوران میری تحقیق زیادہ تر گرافین نام کے ایک مادے پر تھی جس کو استعمال کر کے مختلف آلات بنائے۔ یہ ریسرچ بہت سے بین الاقوامی جریدوں میں شائع ہوئی۔ جب میری ریسرچ شائع ہوئی تو مجھے امریکہ، ابوظہبی، برطانیہ اور ٹوکیو سے مختلف آفرز آئیں۔ میری ریسرچ کیمبرج یونیورسٹی کے ایک مایہ ناز سائنسدان کو اچھی لگی جنھوں نے مجھے وہاں جاب آفر کی۔

ویسے تو تنخواہ اور مراعات کے حساب سے بہتر آفر ابوظہبی سے تھی مگر اب میرا مقصد تنخواہ نہیں بلکہ اگلی منزل تک پہنچنا تھا۔ چنانچہ میں نے کیمبرج یونیورسٹی سے آنے والی آفر کو قبول کیا کیونکہ مجھے تحقیق کے میدان میں کام کرنا تھا اور شاید دنیا بھر میں تحقیق کے حوالے سے سب سے بہتر سہولتیں اور ماحول کیمبرج یونیورسٹی ہی میں دستیاب ہے

جہاں سے نیوٹن اور سٹیفن ہاکنگ جیسے سائنسدان بھی منسلک رہ چکے ہیں۔

دو سال تک کیمبرج میں ریسرچ سائنسدان کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد مجھے سینیئر ریسرچ سائنسدان کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے پتا نہیں مگر کہا جاتا ہے کہ کیمبرج میں ریسرچ سائنسدان سے سنیئر سائنسدان کا درجہ حاصل کرنے کے لیے دو سال بہت ہی کم عرصہ ہے، اور مجھے بھی یہ لگتا ہے کہ میں وہاں پر سب سے کم عمر سینیئر سائنسدان ہوں۔

کیمبرج میں جانے کے بعد بہت سے یورپی کمپنیوں اور سپیس ایجنسیوں کے ساتھ مل کر سپیس ٹیکنالوجی سے منسلک آلات بنائے۔ ان آلات کو ٹیسٹ کرنے کیلیے وقتاً فوقتاً خلائی جہاز اور مصنوعی سیارے لانچ کرتے ہیں جن میں پیرابولک فلائٹ، ساؤنڈنگ راکٹ اور دیگر سپیس کرافٹ شامل ہیں۔ گرافین کو پہلی مرتبہ خلاء میں بھی لے جانے کا موقع ملا۔

مختلف تحقیقات ابھی جاری ہیں جس میں سینسرز کے علاوہ خلاء میں اگر جسم پر زخم لگ جائے تو اس کو کس طرح بھرا جا سکتا ہے، اس پر بھی کام جاری ہے۔

اس کے علاوہ پاکستانی طالب علموں کے لیے برطانیہ کی کچھ تنظیموں کے ساتھ مل کر ایک پروجیکٹ شروع کر رہے ہیں جس میں ان کو سیٹلائٹ کی سہولت فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر مجھے موقع ملا تو اپنے ملک میں جا کر کام کرنے پر فخر محسوس ہوگا۔

پانی میں شفا

دم کرنے سے پانی میں شفا کیسے آتی ہے سائنسی تحقیق۔ پانی کا اپنا نہ کوئی رنگ ہے نہ بو اور نہ ہی کوئی ٹھوس ماہیت۔ بلکہ پانی ہر چیز کے اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور جس چیز میں ڈالو وہی ماہیت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک جاپانی سائنس دان Dr.Masaru Emoto نے پانی پر مختلف تجربے کیے جس کا احوال ان کی کتاب The hidden message in water میں بیان کیا گیا ہے، جس کا اردو ترجمہ محمد علی سید نے اپنی کتاب ''پانی کے عجائبات'' میں بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے، جسے پڑھ کر ہمیں شکر اور ناشکری کے الفاظ کے حیران کن اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس جاپانی سائنس دان نے پانی کو اپنی لیبارٹری میں برف کے ذرات یعنی کرسٹلز کی شکل میں جمانے کا کام شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ڈسٹلڈ واٹر، نلکے کے پانی اور دریا اور جھیل کے پانیوں کے نمونے لیے اور انھیں برف کے ذرات یعنی Crystals کی شکل میں جمایا۔ اس تجربے سے اسے معلوم ہوا کہ پانی، اگر بالکل خالص ہو تو اس کے کرسٹل بہت خوبصورت بنتے ہیں لیکن اگر خالص نہ ہو تو کرسٹل سرے سے بنتے ہی نہیں یا بہت بدشکل بنتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ڈسٹلڈ واٹر سے (جو انجکشن میں استعمال ہوتا ہے) خوبصورت کرسٹل بنے، صاف پانی والی جھیل کے پانی سے بھی کرسٹل بنے لیکن نلکے کے پانی سے کرسٹل بالکل ہی نہیں بنے کیوں کہ اس میں کلورین اور دوسرے جراثیم کش اجزا شامل تھے۔ اس نے ایک اور تجربہ یہ کیا کہ ایک ہی پانی کو مختلف بوتلوں میں جمع کیا اور ہر بوتل کے سامنے مختلف قسم کی موسیقی بجائی۔ موسیقی کی ہر قسم سے کرسٹلز کی ایک نئی شکل بنتی گئی۔ مطلب پانی ہر موسیقی کا مختلف اثر لیتا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور تجربہ کیا جس کے نتائج حیران کر دینے والے تھے۔ اس نے شیشے کی سفید بوتلوں میں مختلف اقسام کے پانیوں کے نمونے جمع کیے۔ ڈسٹلڈ واٹر والی بوتل پر اس نے لکھا "You Fool" اور نلکے کے پانی والی بوتل پر لکھا ''Thank You''، یعنی خالص پانی کو حقارت آمیز جملے سے مخاطب کیا اور نلکے کے پانی کو شکر گزاری کے الفاظ سے اور ان دو بوتلوں کو لیبارٹری میں مختلف مقامات پر رکھ دیا۔ لیبارٹری کے تمام ملازمین سے کہا گیا جب اس بوتل کے پاس سے گزرو تو You Fool والی بوتل کے پانی کو دیکھ کر کہو ''You Fool'' اور ''Thank You'' والی بوتل کے پاس ٹھہر کر سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک جاؤ اور بڑی شکر گزاری کے ساتھ اس سے کہو ''Thank You''۔ یہ عمل 25 دن جاری رہا۔ 25 ویں دن دونوں بوتلوں کے پانیوں کو برف بنانے کے عمل سے گزارا گیا۔ نتائج حیران کن تھے۔ ڈسٹلڈ واٹر سے (جو خالص پانی تھا اور اس سے پہلے اسی پانی سے بہت خوبصورت کرسٹل بنے تھے) کرسٹل تو بن گئے لیکن انتہائی بدشکل۔ ڈاکٹر اموٹو کے کہنے کے مطابق یہ کرسٹل اس پانی کے کرسٹل سے ملتے جلتے تھے جن پر ایک مرتبہ انھوں نے ''SATAN''، یعنی شیطان لکھ کر رکھ دیا تھا۔ نلکے والا پانی جس سے پہلے کرسٹل نہیں بنے تھے، اس مرتبہ اس پر ''تھینک یو'' لکھا ہوا تھا اور کئی لوگ 25 دن تک اس پانی کو دیکھ کر ''تھینک یو'' کہتے رہے تھے، اس پانی سے بہترین اور خوب صورت کرسٹل بن گئے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ پانی باتوں کا بھی اثر لیتا ہے اور ویسی ہی ماہیت اپنا لیتا ہے۔ اچھی باتوں سے اچھی ماہیت اور بری باتوں سے بری۔ Thank you اور you fool والا تجربہ کھانے کی چیزوں کے ساتھ بھی کیا گیا۔ ایک کیک کے دو پیس کاٹے گئے اور ایک کو Thank you کہا گیا اور دوسرے کو You fool. ایک بار پھر نتیجہ یہ نکلا کہ برے الفاظ والا کیک پیس اپنے نارمل وقت سے بھی بہت پہلے خراب ہو گیا جبکہ اچھے الفاظ والا کیک پیس اپنے نارمل وقت سے کافی زیادہ وقت تک تازہ اور ذائقہ دار رہا۔ مطلب کھانے پینے کی ہر چیز الفاظ اور سوچ کا اثر لیتی ہے۔ ان تجربات سے ہمیں یہ بات سمجھ آئی کہ جب ہم پانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ہیں تو اس میں کس طرح برکت پیدا ہوتی ہے کھانے پینے کی چیزوں پر سورت فاتحہ یا کوئی بھی کلام پاک پڑھتے ہیں تو پانی کی ماہیت کس طرح تبدیل ہو کر پینے والے شفا دیتی ہے۔ جب ہم روٹی کے ہر لقمے پر اللہ کا نام یا واجد پڑھ کر کھاتے ہیں تو وہ کس طرح ہمارے اندر نور پیدا کرتا ہے۔ سبحان اللہ لیکن یہاں ایک اور تجزیہ بھی سامنے آتا ہے کہ ہم کھانے پینے کی اشیاء سامنے رکھ کر جو جو بولتے ہیں اور جو جو سوچتے ہیں ہمارے کھانے اس کا بھی اثر لیتے ہیں۔ منفی سوچ اور منفی باتوں کا برا اثر اور اچھی باتوں کا اچھا اثر۔ کھانے کے دوران لوگوں کی غیبت کریں گے تو کھانا برا اثر لے کر ہمارے پیٹ میں جائے گا۔ اگر ٹی وی ڈرامے یا فلمیں دیکھتے ہوئے کھانا کھائیں گے تو وہ کھانا ہمارے پیٹ میں جا کر بھی ویسا ہی اثر دکھائے گا۔ بڑا ہی دلچسپ مضمون ہے۔ پڑھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ فخر اور ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ ہمارا دین ہمارا رب اور ہمارے مہربان نبی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال سے بھی پہلے ہمیں کیسی عظیم نعمتوں سے نوازا۔۔۔ سبحان اللہ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ سنت طریقہ اپنائیں بیماریوں سے بھی حفاظت اور نبی ﷺ پر عمل کا ثواب بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ملے گا۔

لہور، لہور اے

انصر رضا۔ ٹورنٹو، کینیڈا

لاہور ایک طلسماتی لفظ ہے جو شہر سے وابستہ ہو تو اسے ملکہ نور جہاں کے الفاظ میں جنت دیگر بنا دیتا ہے

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم وجنت دیگر خریدہ ایم

اور کسی ادبی جریدے کے ماتھے پر سجے تو اسے انوکھی اور اچھوتی آب وتاب بخش دیتا ہے۔ غالباً اسی لئے مکرم ومحترم جناب ثاقب زیروی صاحب مرحوم ومغفور نے اپنے جریدے کا نام ''لاہور'' رکھا جس میں ادب کی چاشنی، تاریخی حکایات، شاعری، سیاسی حالات اور ہلکا پھلکا مذہبی رنگ بھی ویسے ہی گھل مل کر ایک خوبصورت تصویر بن کر ہمارے ہاتھوں میں آیا کرتا تھا جس طرح یہ سارے رنگ شہر لاہور میں ہر جگہ بکھرے نظر آتے تھے اور مل کر لاہور کو لاہور بناتے تھے۔ خاکسار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی چند تحریریں اس مؤقر جریدہ میں شائع ہوئیں اور اس کے ساتھ ساتھ جناب ثاقب زیروی صاحب سے ان کے دفتر اور گھر میں ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا جہاں انہوں نے بڑی شفقت سے اس نوآموز کی حوصلہ افزائی فرمائی اور مزید لکھتے رہنے کی ترغیب دی۔ ''پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی''۔ جس طرح شہر لاہور کی جنت کو بنیاد پرستی، مُلّائیت، فرقہ وارانہ نفرت اور تعصب نے جہنم بنا دیا اسی طرح جریدہ لاہور کا سورج بھی اس تاریکی میں گہنا گیا اور باقاعدہ حملے کر کے اس کی اشاعت کو روک دیا گیا۔ شاید بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہو کہ جریدہ لاہور احمدیت کے ایک سخت مخالف جناب شورش کاشمیری صاحب کے چٹان پریس میں شائع ہوتا تھا۔ لوگ شورش صاحب کو یہ جریدہ چھاپنے سے منع بھی کرتے تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ میرے سارے گاہکوں میں زیروی صاحب واحد گاہک ہیں جو ہمیشہ وقت پر پیسے ادا کرتے ہیں اور کبھی تنگ نہیں کرتے۔ یہ ایک احمدی مسلمان کی دیانتداری کو ہی نہیں بلکہ احمدیت کی سچائی کو خراج تحسین ہے جو ''والفضل ماشھدت بہ الاعداء'' کے مصداق دشمن کی طرف سے دیا گیا۔ شورش صاحب کی وفات کے بعد وہ روایتی وضع داری اور شرافت تو دفن ہوئی سو ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جریدہ لاہور کی بندش سے ادب وثقافت اور علم ومعرفت سے شغف رکھنے والے لوگ یہ یقین کر گئے کہ اب یہ سورج تا ابد غروب ہو گیا۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ مشرق میں غروب ہونے کے بعد یہ سورج مغرب سے طلوع ہوا اور اب وہی لاہور ''لاہور انٹرنیشنل'' بن کر لندن برطانیہ سے دو زبانوں اور نئے رنگوں نئی روشنیوں کے ساتھ ابھرا اور کیا خوب ابھرا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور مردہ سے زندہ کو۔ دشمن تو جریدہ لاہور کی اشاعت کو پاکستان میں بند کروا کر سمجھا تھا کہ اب اس کی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہے لیکن جیسا کہ غالب نے کہا ہے کہ:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

اُسی طرح جریدہ لاہور کا یہ سیل رواں آگے بڑھنے کا راستہ نہ پا کر بلندی کی طرف گامزن ہوا اور زمین کے شمالی کرّہ میں پوری آب وتاب کے ساتھ بحمد اللہ نمودار ہو گیا۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ اگر قدیم جریدہ لاہور قائم بھی رہتا تب بھی اسے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا۔ جناب محی الدین عباسی صاحب نے جب لاہور کے احیائے نو کا سوچا تو یقیناً یہ بات ان کے ذہن میں تھی کہ جریدہ لاہور کو نہ صرف ایک مُلکی یعنی نیشنل سے بڑھا کر بین الاقوامی یعنی انٹرنیشنل کیا جائے، نہ صرف اردو زبان تک محدود کرنے کی بجائے دو زبانوں میں شائع کیا جائے بلکہ اسے اس طرح سے قدیم وجدید کا ایک حسین امتزاج بنا کر پیش کیا جائے جس میں قارئین کو پرانے لاہور کی خوشبو بھی آئے اور ساتھ ہی ساتھ نئے پھولوں کا دلکش منظر بھی نظر آئے۔ اس لحاظ سے خاکسار سمجھتا ہے کہ جناب محی الدین عباسی صاحب اور ان کی ٹیم کامیاب رہی ہے اور مبارکباد کی مستحق ہے۔ اللھم زد فزد! خاکسار ان کے لئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، اس کٹھن راہ میں حائل ہر مشکل کو دور فرمائے اور جریدہ لاہور انٹرنیشنل کو ایک مقبول جریدہ بنائے اور اس کے ذریعہ وہ علم چاروں طرف پھیلے جس کی بنیاد مکرم ومحترم جناب ثاقب زیروی صاحب نے رکھی تھی۔

ادارتی نوٹ

محترم انصر رضا صاحب اردو ادب سے گہرا شغف رکھنے والے ایک منجھے ہوئے لکھاری، ایک مذہبی سکالر ہونے کے ساتھ ساتھ ٹورنٹو، کینیڈا میں ریڈیو پر باقاعدہ ہفتہ وار ایک پروگرام بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت مقتدر ادبی ومذہبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ نے اپنی تحریر میں ہمیں قابل صد احترام ثاقب زیروی صاحب کے جانشینوں کے طور پر پیش کیا ہے، جبکہ ہم اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی جناب سے اس علم صحافت کو بلند کئے رکھنے کی کما حقہ توفیق عطا فرماتا رہے، آمین۔

فضل الرحمن کھوکھر
ایڈیٹر لاہور انٹرنیشنل

خورشید ہوٹل کے منے میاں سے صادق حلوہ پوڑی کے غلام رسول تک

تحریر خالد مسعود خان

اگر مسئلہ صرف کھانے پینے کا ہو تو لاہور اور گوجرانوالہ سے اچھا شہر شاید دنیا بھر میں اور کوئی نہیں۔ میں یہ بات ذاتی پسند کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ اس سے اختلاف ممکن بھی ہے اور دوسروں کا حق بھی۔ دیگر کئی شہروں میں بھی کھانے کی بعض خصوصی چیزیں موجود ہیں' لیکن لاہور کے بارے میں میرا کہنا مجموعی کھانوں کے حوالے سے ہے۔ اب ملتان ہی دیکھیں! یہاں کی دال مونگ، سوتری وٹ واولوں کے بغیر گھی کے چنے، ڈولی روٹی، درباری کے کباب اور خورشید ہوٹل کا مرغ روشٹ۔ جی ہاں! مرغ روسٹ نہیں، مرغ روشٹ۔ روشٹ اس لئے کہ خورشید ہوٹل کے اکلوتے کمرے کی دیوار پر لگے ہوئے بورڈ پر اس ڈش کا نام یہی لکھا ہوا ہے اور یہی اس ایک کمرہ کے ہوٹل کی اصل پہچان ہے۔ ایک کمرہ تو آپ کو سمجھ آ گیا ہوگا لیکن یہ ایک نفری والا معاملہ یہ ہے کہ اس ہوٹل کے کارنر میں چھوٹی سی میز کے پیچھے اس کا اکلوتا پروپرائٹر اور کچن سے ڈائننگ روم تک سروس پر مامور اکلوتا ''منے میاں''۔ منے میاں کے بغیر خورشید ہوٹل کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا مالک تو کبھی کبھار اپنی کرسی سے غائب ہو جاتا تھا۔ مگر منے میاں! منے میاں کو کبھی بھی غیر حاضر نہ دیکھا۔ نہ غیر حاضر اور نہ کبھی سست یا تھکا ہوا دیکھا۔ گول مٹول منے میاں کے منہ پر ہمیشہ بچوں جیسی ہنسی اور بچوں جیسی ہی پھرتی اور بے قراری تھی۔ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے خورشید ہوٹل منے میاں کے بغیر مل رہا ہے۔ روشٹ ویسا ہی لذیذ ہے۔ دال اتنی ہی مزیدار ہے اور پڈنگ اسی طرح ذائقے دار ہے۔ سب کچھ ہی ہے لیکن منے میاں کے بغیر دوپہر کے وقت ہمیشہ کی طرح بھرا ہوا یہ ایک کمرے کا ہوٹل کم از کم مجھے بالکل ویران لگتا ہے۔

میں نے خورشید ہوٹل میں پہلی بار کھانا کب کھایا تھا؟ ایمانداری کی بات ہے مجھے بالکل یاد نہیں' لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ یہ کم از کم بھی اڑتیس انتالیس سال پرانی بات تو ضرور ہوگی جب میں اور منیر چودھری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہونے والی بین الکلیاتی تقریبات میں حصہ لینے پر کالج سے ملنے والے ''ٹی اے ڈی اے'' وغیرہ کی مد میں ایک سیزن میں ہزار ڈیڑھ ہزار روپے بچا لیتے تھے۔ تب یہ رقم قارون کے خزانے سے معمولی سی ہی کم ہوتی تھی۔ تانگے کا کرایہ اس فارم میں لکھا ہوا ہوتا تھا ہم نہایت ایمانداری سے اتنا ہی کرایہ درج کرتے جتنا گھر سے ریلوے سٹیشن تک بنتا تھا' لیکن اکثر اوقات ریلوے سٹیشن جانے کے لئے کسی سائیکل والے سے لفٹ لیتے تھے۔ قلی کے دو روپے مقرر تھے۔ یہ ہر چکر پر کل آٹھ روپے بن جاتے تھے۔ مثلاً ملتان سے جاتے ہوئے قلی کے دو روپے ساہیوال اترنے پر قلی کے دو روپے اور اسی طرح واپسی کے دو عدد کرائے۔ کل آٹھ روپے ملتے۔ ظاہر ہے ہمارے پاس ہوتا ہی کیا تھا جسے قلی اٹھاتا۔ ہم خود ہی قلی ہوتے تھے۔ ریلوے کے رعایتی فارم تھوک کے حساب سے مرحوم اقبال عباس نقوی صاحب جو یونین کے انچارج تھے ان سے دستخط کروا کے پیشگی رکھے ہوتے تھے۔ ٹی اے ڈی فارم پر کرتے وقت جتنی احتیاط کی جاتی تھی اتنی تو ہم نے کبھی ریاضی کے پرچے میں نہیں کی ہوتی تھی۔ ہمارے فارم آڈٹ کے لئے پروفیسر عبدالحمید صاحب کے پاس جاتے تھے' جو پچاس پیسے تک کی غلطی کو ایسے پکڑتے تھے کہ اس کی مثال دینے کے لئے بھی کچھ یاد نہیں آ رہا۔

اس آمدنی کے سیزن کے بعد میں اور منیر چودھری مالی طور پر خوشحال ہو جاتے تھے اور مل جل کے درباری کباب پراٹھہ اور خورشید ہوٹل پر ہلہ بول دیتے۔ کالج کی کینٹین سے سال بھر ادھار پر کھائے ہوئے سموسوں اور پی گئی سکوائش کی یکمشت ادائیگی کی جاتی۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے شیخ مجید صاحب کو جو گیارہ مہینے اسی آسرے پر ادھار دیتے تھے۔ تب سلیم درباری خود کباب لگایا کرتے تھے۔ اب وہ صرف اپنی تین برانچوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ خورشید ہوٹل منیر چودھری پہلی بار میرے ساتھ گیا تھا۔ میں اس سے پہلے ایک دو بار جا چکا تھا لیکن کس کے ساتھ؟ یہ یاد نہیں۔ منے میاں کو تب خورشید ہوٹل میں دیکھا اور پھر میرے بچوں نے بھی دیکھا۔ اس ایک کمرہ ہوٹل کو درست حساب کے مطابق ایک کمرہ نہیں کہا جانا چاہئے۔ اسے آپ سوا کمرے پر مشتمل کہہ سکتے ہیں۔ ڈائننگ ہال کے کونے میں لگے ہوئے واش بیسن اور ٹوٹی کے ساتھ ایک چھ سات فٹ مربع کمرہ ہے۔ یہ فیملی روم ہے۔ ہم اس میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

جس دن ہمیں بالکل سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کھائیں۔ اس روز خورشید ہوٹل یا درباری کباب پراٹھہ میں سے کسی ایک کے نام قرعہ نکلتا تھا۔ صورتحال یہ ہے کہ سارہ آسٹریلیا سے آئی تو دوسرے ہی دن کہنے لگی: آج رات درباری کے کباب کھائے جائیں گے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ درباری جیسے کباب کم از کم میں نے اپنی ''پھیرے ٹورے'' والی زندگی میں اور کہیں نہیں کھائے۔ یہی حال خورشید ہوٹل کے روشٹ کا ہے۔ ملتان کی گرمی میں کچن سے جڑے ہوئے اکلوتے ڈائننگ ہال میں گرمی، حبس اور کالے پنکھے کے نیچے کھانا آسان کام نہیں' لیکن خورشید ہوٹل میں یہ کبھی بھی مشکل نہیں لگتا تھا۔ لیکن ساری رونقیں منے میاں کے دم سے تھیں۔

پہلے پہل میرے بچوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ منے میاں ان کو خصوصی پروٹوکول، مسکراہٹ، خوش خلقی اور پھرتی سے نوازتا ہے۔ کبھی یہ خوش فہمی ہمیں بھی ہوتی تھی' لیکن پھر یہ خوش فہمی دور ہوگئی۔ منے میاں کسی میخانے کے کم ظرف ساقی نہ تھے' جن کے بارے میں خاموش غازی پوری کا شعر ہے؛

سب کی نظروں میں ہو ساقی یہ ضروری ہے مگر
سب پہ ساقی کی نظر ہو یہ ضروری تو نہیں

کھچا کھچ بھرے ہوئے کمرے میں تین چار بڑی اور تین چار چھوٹی میزوں پر کسی کھانے والے کے سامنے پڑا سالن کم ہو رہا ہے اور کسی کی روٹی ختم ہو رہی ہے' منے میاں کی آنکھ سے کچھ بھی اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک روز خورشید ہوٹل گیا تو منے میاں ڈائننگ روم میں نہیں تھے۔ پوچھا تو پتا چلا کہ منے میاں علیل ہیں۔ یقین مانیں بڑی حیرانی ہوئی کہ منے میاں بھی علیل ہو سکتے ہیں؟ منے میاں تو ہمارے نزدیک ایک روبوٹ تھے۔ دنیا کی بہترین پروگرامنگ کی روشنی میں بنے ہوئے۔ خوش اخلاق، متحرک، فرض شناس اور زندہ دل۔ گاہکوں کے ساتھ کبھی لڑنا تو ایک طرف رہا کبھی منہ بسورتے بھی نہ دیکھا۔ ایک ماہ بعد دوبارہ خورشید ہوٹل گیا تو منے میاں پھر موجود نہیں تھے۔ ڈرتے ڈرتے میاں کے بارے میں پوچھا' پتا چلا کہ منے میاں تو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ میں کھانا کھائے بغیر واپس آ گیا۔

اب بھی خورشید ہوٹل جاتا ہوں' مگر کبھی وہاں بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتا۔ روشٹ پیک کرواتا ہوں اور گھر لے آتا ہوں۔ خورشید ہوٹل کا وہی پرانا باورچی ہے اور وہی پرانا روشٹ۔ وہی پرانا کمرہ ہے اور وہی پروپرائٹر۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اب اس ہوٹل کے مالک کے چہرے پر بھی وہی مسکراہٹ کبھی دیکھنے کو نہیں ملی جو دو سال پہلے ہوا کرتی تھی۔ ممکن ہے کبھی کبھار آنے والوں کو منے میاں کی کمی کا کبھی احساس بھی نہ ہوا ہو' مگر میں نے تو گزشتہ چالیس سال میں خورشید ہوٹل اور منے میاں کو کبھی علیحدہ کر کے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب اس عمر میں دونوں کو علیحدہ سے دیکھنا بھلا کس طرح ممکن ہے؟

صادق حلوا پوری والا کبھی اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے دراوزے کے عین سامنے ہوا کرتا تھا۔ دس بارہ سال پہلے وہ اسی سڑک پر تھوڑا آگے چلا گیا' جہاں گاڑی کھڑی کرنے کی زیادہ آسانی اور سہولت تھی۔ صادق کی حلوہ پوڑی کی یادیں تو خورشید ہوٹل سے بھی پرانی ہیں۔ تایا جی نواز اتوار کو صادق سے حلوہ پوڑی، قتلمے اور مال پوڑے لاتے تھے۔ وہاں بھی ایک ''منے میاں'' تھا غلام رسول۔ آخری بار صادق کی حلوہ پوڑی کھائے بھی عشرہ گزر گیا ہے۔ دنیا کی سب سے لذیذ حلوہ پوڑی کے بارے سوچتا ہوں تو منہ میں پانی آ جاتا ہے' لیکن اب تو صرف اس ڈر سے وہاں نہیں جاتا کہ اگر غلام رسول وہاں نہ ہوا تو؟

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

شعبہ بین الاقوامی

تارکین وطن

جس طرح ترقی پسندی کو سب سے زیادہ نقصان نام نہاد ترقی پسندوں کے کردار و معیار نے پہنچایا ہے بالکل اسی طرح اسلام اور اس کے ماننے والوں کو سب سے زیادہ دھچکا سیاسی وغیر سیاسی غرض پرست مُلّائیت سے لگا ہے۔ دینِ اسلام وہ عظیم مذہب ہے جو اپنی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے باعث انتہائی اہم مقام رکھتا ہے۔ جس کی کتاب القران المجید میں ہر قدم پر انسانیت کے ساتھ بہترین روّیہ رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ دشمن سے بھی رواداری برتنے کا کہا گیا ہے جس کی مثالیں نبی پاکؐ کے شب و روز میں جابجا ملتی ہیں۔ پاکستان جو بنایا ہی کلمہ طیّبہ کے نام پر گیا ہے جانے کیوں اتنی زبوں حالی کا شکار ہے۔ سپریم کورٹ فیصلے کے بعد خود کو بہتر مسلمان قرار دینے والے گروہوں نے اپنے ہی ہم وطنوں کو کس بُری طرح سے تشدد کا نشانہ بنایا، بچوں سے لے کر بڑوں تک کو ذہنی وجسمانی اذیتوں سے گزارا اور سرکاری وغیر سرکاری املاک کو تباہ کیا گیا کیونکہ انہیں وہ نتائج چاہیے تھے جو انہوں نے سوچے ہوئے تھے۔ اگر سنت نبویؐ کی پیروی کی جاتی تو کبھی یہ تباہ کاریوں کے مناظر سامنے نہ آتے کہ ہم تو اُن رحمت للعالمین کی اُمّت ہیں جو اپنے دشمن سے بھی رواداری و درگزر سے پیش آتے تھے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مسلمان پوری دنیا میں کسی نہ کسی سطح پر اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مسلم اکثریت والے ممالک میں ایک عجیب طرح کی بے حسی پائی جاتی ہے، وہ اس امر کی طرف دھیان دینے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں کہ مُسلمان باشندے جہاں جہاں اقلیت میں ہیں کیسے کیسے مسائل سے گزر رہے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اپنی اصل دھرتی سے ہجرت کرتے ہی ہجرت زدوں کے تمام حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ہجرت کے محرکات کو دیکھیں تو سب سے بڑا محرک معاشی بدحالی ہے اور اس کے بعد امنِ عامہ کی صورتِ حال۔ دیگر معاشرتی ناہمواریوں سے نبرد آزما رہنا تو ایک مسلسل عمل ہے مگر دو صورتوں میں ہجرت تقریباً ناگزیر ہو جاتی ہے کہ جب رزق کا کوئی وسیلہ نہ بنتا ہو یا زندگی خطرے میں ہو۔ اگر اپنے مُلک میں ذریعہ معاش کا حصول سہل ہو اور اپنے خاندانوں کی پرورش کے لیے کافی ہو تو بہت کم لوگ دور دراز سفر کا سوچیں۔ ان تمام پہلوؤں سے ماورا بطور مسلمان ہم ایمان رکھتے ہیں کہ اُس خالقِ کُل کائنات نے جہاں رزق لکھا ہے وہیں سے ملے گا۔ تارکینِ وطن خواہ وہ کسی بھی خطّہ سے تعلق رکھتے ہوں اگر اپنے مسائل کی بات کریں تو انہیں انتہائی تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے پھر اتنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ باقاعدہ طعنہ زنی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے کہ زیادہ سرمایہ اکٹھا کرنے کے شوق نے دیس نکالا دیا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام عمر رشتوں اور رابطوں کی قیمت ادا کرنے والوں کے پاس سرمایہ اکٹھا ہی کہاں ہوتا ہے۔ یہ معاملات صرف پاکستانی تارکینِ وطن کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ کم و بیش سبھی اس کشمکشِ سود و زیاں سے گزرتے ہیں۔ جہاں جنم لیتے ہیں وہ مٹّی بھی آہستہ آہستہ اجنبی ہو جاتی ہے اور جس دھرتی پر جا کر بستے ہیں وہ بھی خون و پسینہ جذب کر لینے کے باوجود پناہ گیر ہی سمجھتی رہتی ہے۔

شالا مسافر کوئی نہ تھیوے کھ جنہاں تھیں بھارے ہو
گلیاں دے وِچ پھرن آزرداں، لعلاں دے ونجارے ہو

نائن الیون کے تاریخی سانحہ کے بعد، جس کے بارے میں معتبر محققین کا گمان ہے کہ یہ ایک بااثر اور خوشحال مُسلمان مُلک کی صرفِ نظری اور مُسلم کُش طاقتوں کی مِلی بھگت سے وجود میں آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اتنی کشیدگی پھیلی کہ اسلحہ کی صنعت پر ترقی کرتے ممالک کو بے پناہ فائدہ ہوا اور ایک جیسے مکتبہ فکر کے دیگر ممالک نے بھی مفادات کے حصول کو اس واقعہ کے تناظر میں اپنے لیے آسان بنایا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں مُسلم تارکینِ اس سانحہ سے کُلّی طور پر متاثر ہونے کے باوجود بھی دلجوئی کے قابل نہیں سمجھے گئے بلکہ معاشی، سماجی، مذہبی وجذباتی سطح پر تہہ در تہہ سزاوار ٹھہرے۔ ہر مُلک کے شہروں وقصبوں میں بسنے والے بیشتر مقامی باشندوں کے دلوں میں ''گوانتاناموبے'' ڈیٹینشن سنٹر کھل گئے۔ ساتھ ہی ساتھ مستحکم مسلم ممالک میں اپنی اندھا دُھند برتری برقرار رکھنے اور تیل کے کنوئیں بچانے کی دوڑ جاری رہی۔ اتنے برس گزر گئے تارکینِ وطن کو اپنے مذہبی عقیدے، رہن سہن، زبان و بیان پر جوابدہ رہتے ہوئے اور اب بھی یہ عالم ہے کہ ''شوٹنگ'' کا کوئی واقعہ ہو یا اس جیسا کوئی پُر اسرار حادثہ سب سانس روک کر بیٹھ جاتے ہیں کہ دیکھیے یہ کس طرح سے طالبان، القاعدہ اور داعش کی آڑ میں کسی محمد، علی، عبداللہ، جمال یا خان کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جبکہ دہشت گردی کے پورے منظر نامہ پر نظر ڈالیں یہ سچائی عیاں ہوتی ہے کہ انگلش بولنے

Shahi Caterers UK

Catering, Wedding and
Event Management Services

Your events with a better taste
We provide catering services for Weddings, Parties, Home and Religious Events
We provide full Decoration and Event planning service
We pride ourselves for Food Quality unlike High Street Resturants

Syed Abidi 07949705902
Mohiuddin Abbasi 07940077825
Website: www.shahicaterers.uk Email: info@shahicaterers.uk

والی داعش کس طرح منظم ہوئی، القاعدہ کے پاس خاص ساخت کے اسلحہ اور مغربی کرنسی کا وجود..... چہ معنی دارد۔ اس عالمی انتشار میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام مسلم مُمالک میں سفارت خانے تارکینِ وطن کے حقوق کے لیے پوری طرح سے فعال ہو جاتے۔ تھنک ٹینک بنائے جاتے جو وسیع تر سیاسی وسماجی خلفشار کے اپنے اپنے مقامی معاملات پر اثر انداز ہونے کا جائزہ لیتے، اور جو پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں انہیں سُلجھانے کی کوشش کی جاتی یا کم از کم مسائل کے تذکرہ کے لیے ہی کچھ فورم بن جاتے۔۔ مگر کیا کہیے اب تو یہ عالم ہو چکا ہے، کہ اگر سعودی سفارت خانہ ہو تو شاہِ سعود کے طرزِ حکمرانی پر تنقید کرنے والا عربی صحافی جمال خاشقجی جو ایک وقت میں سعودی حکومت کا معاون بھی رہا تھا، کسی ذاتی مجبوری یا ممکنہ سازش کے نتیجے میں سفارت خانہ آتا ہے جہاں پندرہ تربیت یافتہ اس پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اذیتناک طریقہ سے اس کی جان لے لیتے ہیں پھر اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی تو اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تیزاب میں رکھا جاتا ہے اور سفارت کار کے گھر کے لان میں دبا دیا جاتا ہے۔ یہ تو خیر بدترین مثال ہے۔ پاکستانی شہری ہونے کے ناطے پاکستانی سفارت خانوں میں ایسے ظلم و بربریّت کا تو تصوّر و امکان بھی نہیں ہے۔ بس وہ اپنی کمیونٹی کے مسائل کی طرف سے اکثر اوقات بے نیاز پائے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ عمدہ سفارت کار تعینات نہیں یا کام نہیں کرنا چاہتے مگر لیکن فکر انگیز سرگرمیاں ان کی ترجیحات میں شامل نہیں رہ پاتیں۔ کبھی وہ اپنے سٹاف کی نااہلیوں اور کمیونٹی کے خوشامدی ٹولوں میں گھر کر رہ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سفارت خانوں کے ملازمین اپنے اور اپنے خاندانوں کے مستقل قیام کے وسیلے تلاش یا وضع کرنے میں پریشان رہتے ہیں۔ سوچیں تو یہ بھی کیا کم ہے کہ سو پاپڑ بیلنے کے بعد بصد احسان پاکستانیوں کو ویزا و پاسپورٹ کی سہولت فراہم کر دی جاتی ہے یا پھر بنیادی سطح کے ادبی وغیر ادبی پروگرام کروا دیئے جاتے ہیں۔ یہ تمام سرگرمیاں بھی اہم ہیں لیکن سب سے اہم یہ ہے کہ سفارت خانے مقامی حکومتوں اور تارکینِ وطن کے درمیان ممکنہ حد تک ایک پُل کا کام کریں تا کہ نظامِ زندگی پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہو سکیں۔ شکر ہے کہ تارکینِ وطن پاکستانیوں کے ووٹ کا حق تو تسلیم کیا گیا۔۔ دیر آید درست آید۔

پنجاب کے دریا اور شہر

تحریر اسد سلیم شیخ

قدیم شہر زیادہ تر دریاؤں کے کنارے یا اُن کے نزدیک آباد ہوئے اور آج بھی آباد ہیں البتہ کئی شہر صدیوں کے عمل کے نتیجے میں رُخ بدلنے کے باعث دریاؤں سے دُور ہو گئے۔ ہیروڈوٹس کے مطابق قدیم ایام میں دریائے سندھ ہڑپہ کے مغرب میں کہیں نزدیک ہی بہتا تھا۔ ہڑپہ میں سنسکرت کا لفظ APA سرحد، کنارہ کو ظاہر کرتا ہے۔ گویا یہ پنجاب کے پانچ معاونوں اور سندھ ساگر کے مسروبہ علاقوں کی حد پر تھا۔ رگِ وید میں ہڑپہ کی لڑائی اسی حد پر ہوئی تھی۔ دریائے سندھ مغرب کی طرف ہٹنا شروع ہوا اور اس کے پانچ معاون دریا بھی اپنے راستے بدلنے لگے۔ سکندرِ اعظم کے حملہ ہندوستان کے وقت چناب اور سندھ کہروڑ کے قریب آپس میں ملتے تھے۔ اس دَور میں چناب جہلم کے مسروبہ علاقوں میں گُھس گیا۔ راوی اور بیاس بٹالہ کے قریب مل کر اکٹھے ہڈیارہ نالہ میں لاہور اور قصور کے درمیان بہتے تھے۔ قدیم زمانہ میں کسی زلزلہ کے نتیجے میں راوی بٹالہ کے اُوپر شمال کی طرف مڑ گیا۔ بٹالہ پر مرکوز روہی نالہ اور پٹی نالہ اس کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ بیاس کی وادی کے گردونواح میں زلزلہ کے باعث قصور کہروڑ پکا لمبائی میں بہاولنگر سے ساہیوال کے قریب تک پانچ ہزار سال پہلے پوری زمین دھنس گئی تھی اور اس وجہ سے کئی شہر مٹی کا ڈھیر ہو گئے تھے۔ بیاس بھی اپنی رہگزر چھوڑ کر جنوب مغرب کی طرف چلا گیا ہے۔ اب اسے سُکھ بیاس کہتے ہیں کہ یہ سُوکھ چکا ہے۔ راوی کی قدیم گزرگاہ موجودہ قلعہ ملتان اور شہر کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ گویا پنجاب کے تمام دریا ماضی میں ایک دوسرے کی گزرگاہ پر بہتے رہے ہیں۔ اس لیے ماضی میں اگر ایک شہر دریائے جہلم کے کنارے آباد ہوا تو ہوسکتا ہے کہ وہ صدیوں کے اس عمل کے بعد دریائے چناب کے قریب آ گیا ہو۔ بعض مورّخین کا خیال ہے کہ ۱۲۴۵ء میں جب مغل سردار منگوتہ نے ملتان پر حملہ کیا تو اس وقت ملتان شہر دریائے چناب کے مغربی کنارے پر تھا البتہ جب امیر تیمور ملتان پر حملہ آور ہوا تو ملتان کا شہر دریائے چناب کے مشرق میں واقع تھا اور دریا موجودہ گزرگاہ میں بہتا تھا۔ اسی طرح پندرہویں صدی میں دریائے چناب موجودہ جھنگ شہر کے مشرق میں بہتا تھا اور آج کل یہ دریا جھنگ سے سات میل دُور مغرب میں بہہ رہا ہے۔ پنجاب کے جو شہر اور قصبات دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے اور آج بھی آباد چلے آ رہے ہیں ان میں دریائے سندھ کے کنارے اٹک، مکھڈ، کالا باغ، میانوالی، کُندیاں، پپلاں، بھکر، لیہ، ڈیرہ غازی خان، مٹھن کوٹ، چاچڑاں وغیرہ ہیں۔ یہ تمام شہر اور قصبات کئی مرتبہ سیلاب کی نذر ہوئے اور اس کے ہاتھوں نقصانات اٹھاتے رہے۔ ڈیرہ غازی خان کا پرانا شہر تو مکمل دریا نے ہڑپ کر لیا پھر یہ ۱۹۱۰ء میں موجودہ جگہ پر قائم ہوا۔ انگریزوں کے دَور میں مٹھن کوٹ میں ایسا سیلاب آیا کہ اس کی تمام عمارتیں بہا لے گیا اسی وجہ سے یہاں کی تحصیلی حیثیت ختم کر کے اسے راجن پور منتقل کر دیا گیا۔ دریائے جہلم کے کنارے، جہلم، ملکوال، پنڈ دادنخان، میانی بھیرہ اور سرگودھا کا قصبہ ساہیوال آباد ہیں۔ بھیرہ بھی کئی بار اجڑا، برباد ہوا اور پھر آباد ہوتا رہا۔ دریائے چناب جسے رومانی دریا بھی کہتے ہیں سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا اور سسّی پُنوں کی داستانیں اس سے منسوب ہیں۔ اس کے کنارے آباد ہونے والے شہروں اور قصبات میں سوہدرہ، وزیر آباد، رسولنگر، جلالپور، پنڈی بھٹیاں، چنیوٹ، جھنگ اور شورکوٹ شامل ہیں۔ لاہور، سیّد پور اور چیچہ وطنی راوی کنارے آباد ہیں۔ جب آمدورفت کے جدید ذرائع نہیں تھے۔ سڑکیں پختہ نہیں تھیں۔ ریلوے ابھی جاری نہیں ہوئی تھی تو دریاؤں کے ذریعے تجارت عام ہوتی تھی۔ دریاؤں کے کنارے آباد اکثر قصبوں اور شہروں پر پتن ہوا کرتے تھے جن کے ذریعے مال کی آمدورفت ہوتی تھی۔ دریائے جہلم پر میانی اور پنڈ دادنخان کے مقامات پر مشہور پتن تھے یہاں سے نمک کی تجارت زوروں پر ہوتی تھی۔ جہلم کی لکڑی بھی دریا کے ذریعے سکھر تک پہنچائی جاتی تھی۔ چناب پر رسولنگر، محمود پور، چوچک وغیرہ کے مقامات پر پتن ہوتے تھے اور ملتان تک تجارتی سامان اس ذریعے سے پہنچایا جاتا تھا۔ مغل بادشاہ اکبر نے لاہور کے مقام پر دریائے راوی پر ایک بہت بڑا بیڑا تیار کر کے دریا میں اُتارا تھا جو ہزاروں من وزن اٹھانے کی سکت رکھتا تھا۔ دریائی تجارت کے باعث ان شہروں کے تاجر خوشحال ہوتے تھے ان میں رونق بہ نسبت دوسرے شہروں کے زیادہ ہوتی تھی۔ انگریزوں کے عہد تک یہ خوشحالی اور رونق برقرار رہی۔ سڑکوں کی تعمیر اور ریلوے نظام کے اجرا کے بعد دریائی راستے سے تجارت ختم ہو کر رہ گئی۔ بسیں، ٹرک، اور ریل گاڑیاں دنوں کا کام گھنٹوں میں کرنے لگیں۔ اس طرح دریائی تجارت کے باعث خوشحال شہر اور قصبے بھی زوال پذیر ہونے لگے اور ان کی جگہ ریلوے اسٹیشنوں اور زرعی منڈیوں کے قیام کے باعث نئے شہروں کو عروج حاصل ہونے لگا۔ میانی، پنڈ دادنخان، بھیرہ، مٹھن کوٹ جیسے شہروں کی عظمت ختم ہو کر رہ گئی اور آج یہ ماضی کی شان و شوکت میں گم درمیانے درجے کے پسماندہ قصبات کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ دریاؤں کا وہ پانی جس کے سینے پر چلتی کشتیاں کبھی ان کے پتنوں پر اُترتی تھیں اب ان کے لیے مفید نہیں رہا بلکہ کبھی کبھار ان کے گھروں کو اُجاڑنے کے لیے آ دوڑتا تھا۔ (کتاب ''نگر نگر پنجاب'' سے منقبس)

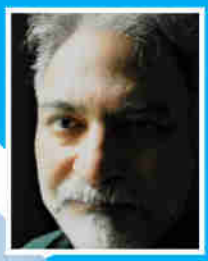

آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟

"R U OK ?"

تحریر ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا

آسٹریلیا میں ہر سال 12 ستمبر کو ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کا دن ''R U OK Day'' کے نام سے منایا جاتا ہے، جو رواں سال ماہ ستمبر میں بھی منایا گیا۔

اس جملہ سے یہ مطلب ہرگز نہ اخذ کیا جائے کہ آسٹریلیا میں لوگ سال بھر میں صرف ایک دن ہی ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں اور باقی کے 364 دن بقول شخصے ''جا جا، تُو کون تے میں کون'' کی پالیسی پر عمل ہوتا ہے، ایسا ہرگز نہیں۔ دراصل یہ دن اسی نام سے جاری ایک سماجی تحریک کے یوم تاسیس کے طور پر اور یاددہانی کے طور پر منایا جاتا ہے کہ لوگ سارا سال ایک دوسرے کا حال دریافت کرتے رہا کریں۔

اس دن اور تحریک کا پس منظر پیش کرنے سے پہلے یہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ مغربی معاشرے کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہاں ہر فرد دوسرے افراد کی انفرادی ذاتی زندگی، شخصی آزادی اور پرائیویسی کا بہت احترام کرتا ہے۔ خواہ مخواہ کسی کے ذاتی معاملات میں نہ تو ٹانگ اڑائی جاتی ہے اور نہ ہی اپنی توانائیاں دوسروں کی ٹوہ میں لگے رہنے میں صرف کی جاتی ہیں۔ ملکی قوانین بھی اس کی اجازت نہیں دیتے۔

لیکن بدقسمتی سے مغربی معاشرے کی اسی صفت یا رویہ کا ایک افسوسناک بلکہ المناک پہلو گزشتہ کتنی ہی دہائیوں میں یہ ابھر کر سامنے آیا ہے کہ پرائیویسی کے احترام کی بنیاد پہ استوار یہ رویہ افراط کا شکار ہو کر باہمی بے گانگی، اجنبیت اور لاتعلقی کے رویوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔

ہمسائے تو دور کی بات، ایک ہی گھر میں رہنے والے، ایک ہی خاندان کے افراد بھی بسا اوقات ایک دوسرے سے اجنبیوں کی طرح ہی ملتے ہیں۔ کسی کو اتنی فرصت یا غرض نہیں ہوتی کہ معلوم کرے کہ دوسرے افراد ٹھیک تو ہیں ناں، انہیں کوئی فکر یا مسئلہ تو درپیش نہیں۔ یہی سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی زندگی ان کی اپنی زندگی ہے، مجھے کیا۔ یا پھر یہ سوچ کارفرما ہوتی ہے کہ ٹھیک ہی ہونگے، جب خود اپنا کوئی مسئلہ مجھے نہیں بتا رہے تو ایسا نہ ہو کہ میرے پوچھنے پر ناراض ہی ہو جائیں، وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح خود کو بھی یہ سوچ لاحق ہوتی ہے کہ مجھے اپنا مسئلہ دوسروں کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسرے نے کیا کر لینا ہے یا یہ کہ بھلا کسی دوسرے، مثلاً بیوی یا بچے یا ماں باپ، دوست، ہم کار وغیرہ کو میری زندگی یا میرے مسئلہ سے کیا سروکار یا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاصی تعداد کو شرم، خودداری، انا، اور یا پھر تضحیک، تشہیر اور جگ ہسائی کا خوف آڑے آ رہا ہوتا ہے۔

تو مسلسل اس قسم کی سوچوں اور رویوں میں گھری زندگی لمحوں کو دن، دنوں کو ہفتوں اور ہفتوں کو مہ و سال میں تبدیل کرتی چلی جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے تو ہیں لیکن دل کی کوئی بات نہیں ہو پاتی۔

بقول شاعر:

کون کہتا ہے ملاقات نہیں ہوتی ہے
روز ملتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی ہے

ایک ہی ڈگر پر چلتی ہوئی بظاہر پرسکون قسم کی اس زندگی میں بھونچال تب آتا ہے جب اپنے اپنے خول میں بند ان افراد میں سے، اہل خانہ میں سے، عزیزوں رشتہ داروں میں سے، ہمسائیوں میں سے، دفتر کے ساتھیوں میں سے، یا سکول کالج کے کلاس فیلوز میں سے کوئی فرد اپنے اس خول کو توڑنے کی بجائے خودکشی کر کے اس قسم کی زندگی سے اپنا ناطہ ہی توڑ ڈالتا ہے۔ ہمیشہ ہمیش کے لئے، کچھ ایسا کہ دوبارہ کبھی نہ جڑ سکے۔

سنہ 1995 کی بات ہے، ایسا ہی بھونچال آسٹریلیا کے ایک جوان گیون

لارکن Gavin Larkin کی زندگی میں بھی آیا جب ایک روز اس کے والد نے چپکے سے اپنی جان لے لی۔اس کو بالکل بھی سمجھ نہ آئی کہ آخر ایسی کون سی وجہ تھی کہ اس کا باپ یوں اچانک، بغیر کسی وارننگ کے، ایک دم اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور ہوگیا۔یہی حال اس کے دیگر بہن بھائیوں حتیٰ کہ والدہ کا بھی تھا۔سب کچھ ٹھیک ہی تو چل رہا تھا۔گھر میں خوشحالی تھی، سوسائٹی میں عزت تھی۔گھر کے باہر نہ ہی گھر کے اندر کسی سے جھگڑا نہ کوئی مسئلہ۔گیون کو یہ احساس بڑی شدت سے ہونے لگ گیا کہ اگر وہ یا گھر کا کوئی فرد والد سے کبھی یہ پوچھ لیتا کہ ''Are you OK?'' یعنی ''آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟ تو شاید وہ اپنے اس مسئلہ یا فکر یا اندرونی کیفیت کے بارہ میں بتا ہی دیتے جو انہیں اندر ہی اندر نجانے کب سے پریشان کر رہی تھی۔

کافی سارے سال تو گیون نے اسی صدمہ، تعجب، اضطراب، احساسِ ندامت، غم وغصہ وغیرہ کے ملے جلے جذبات پر مبنی ذہنی کشمکش سے لڑتے بھڑتے گزار دیئے۔پھر اسے خیال آیا کہ اس کے والد تو اب دنیا میں دوبارہ آنے سے رہے۔وہ اتنا تو کرسکتا ہے کہ معاشرے کی توجہ اس طرف مبذول کروائے کہ جو حادثہ اس کے گھر ہوا وہ کسی اور کے گھر میں نہ ہو۔

پہلے تو اس نے اپنے گھر والوں، دوستوں سے باقاعدگی کے ساتھ ان کی خیریت دریافت کرنا شروع کیا Are you OK? اور بعد ازاں 12 ستمبر سنہ 2009 کو پورے ملک میں عوامی شعور بیدار کرنے کی غرض سے ایک فلاحی سماجی تحریک ''R U O K ?'' کے نام سے جاری کردی، جو دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہوگئی۔

تحریک کا مقصد لوگوں کو اس بات کی طرف راغب کرنا اور ان میں یہ رجحان پیدا کرنا ہے کہ وہ اپنے قرب وجوار میں موجود اپنے جیسے انسانوں سے ان کا حال دریافت کریں اور اگر کسی کو کوئی نفسیاتی، دماغی یا ذہنی مسئلہ یا فکر لاحق ہے تو اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کریں اور پھر دیکھیں کہ ایسے فرد کی کیا مدد کی جاسکتی ہے۔

اگر بالمشافہ نہیں تو موبائل فون پر ٹیکسٹ میسیج کے ذریعہ یا فون کال کرکے یا فیس بک وغیرہ کے ذریعہ بھی یہ ایک مختصر سا سوال پوچھا جاسکتا ہے، جو ہے تو مختصر لیکن کسی انسان کی زندگی کو مختصر ہوجانے سے بچا سکتا ہے۔

اکثر اوقات تو انسان کو صرف کسی دوسرے انسان کے آگے اپنے دکھڑے بیان کرنے کی، دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی سے وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔

اس تحریک کی طرف سے یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ کوشش کی جائے کہ ایک بار جس کسی سے اس کی خیریت دریافت کی جائے، سارا سال وقتاً فوقتاً اس سے یہ سوال پوچھتے رہنا چاہئے تاکہ دوستی اور ہمدردی کا یہ ناطہ اجنبیت کی بجائے اپنائیت کو تسلسل اور دوام دے۔اسی طرح یہ سلسلہ بغیر کسی لالچ یا مفاد کے محض ہمدردی خلائق کے لئے رضا کارانہ طور پر چلانا بھی لازمی ہے۔

افسوس کہ اس تحریک کا بانی Gavin Larkin کینسر کے موذی مرض کا شکار ہوکر جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا لیکن اسکا پیغام، اس کی جاری کردہ تحریک کی شکل میں زندہ وجاوید ہوچکا ہے۔

اب تو اس سلسلہ کو آسٹریلین حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہوچکی ہے۔نجی عطیات کے علاوہ حکومت کے تعاون سے ہی ہر سال 12 ستمبر کو اس تحریک کا یوم تاسیس R U OK Day کے نام سے منایا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حکومت کو علم ہے کہ آسٹریلیا میں ہر سال لگ بھگ دو تا تین ہزار افراد خودکشی کرلیتے ہیں، جبکہ ہر سال کم از کم 60,000 افراد اقدام خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔خودکشی کرنے والوں میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے، اور اسی طرح شرح اوسط کے لحاظ سے آسٹریلیا کے قدیم ایبوریجنی باشندوں میں خودکشی کی شرح سب سے زیادہ ہے۔قدیم آسٹریلین باشندوں میں سے خودکشی کرنے والوں میں 8 اور 10 سال کی عمر کے بچے تک شامل ہیں۔ڈیپریشن اینگزائٹی (یاس وتشویش) کے ذہنی اور نفسیاتی امراض کی شرح اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔

قارئین کرام، دین فطرت، یعنی مذہب اسلام مایوسی اور خودکشی دونوں کو ہی ''حرام'' قرار دیتا ہے۔اس کے باوجود اسلامی ممالک، خصوصاً غریب اور ترقی پذیر ممالک بشمول پاکستان میں بھی آئے روز خودکشی کی خبریں سننے اور پڑھنے کو ملتی ہیں۔سفید پوش طبقہ جس کے لیئے اپنی چادر میں پاؤں پھیلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ چکی ہوتی کیونکہ اس کی چادر کو حالات ومسائل کی قینچی نے کتر کتر کر رومال بناڈالا ہوتا ہے، مایوس، افسردہ یا مشوش نہ ہوں تو کیا کریں۔دیہاتوں میں مائیں اپنے چھوٹے بچوں سمیت نہروں میں چھلانگ لگا کر اپنے اور اپنے بچوں کی عذاب نما زندگیوں کا گورکھ دھندا ہی ختم کرنے پر مجبور نہ ہوں تو کیا کریں۔

پھر اس کے علاوہ ذہنی امراض ہیں جو بدنی امراض کی طرح ہی ہوتی ہیں اور امیر وغریب میں امتیاز نہیں کرتیں۔مثلاً ڈیپریشن (خفقان) ہے، جو انسان کو گھن کی

طرح چاٹ لیتی ہے۔ذہن ماؤف ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ ایسا انسان شریعت کا ہی مکلف نہیں رہتا تو ایسے افراد کو مالی معاونت یا مذہبی تعلیمات کے لیکچر کی نہیں بلکہ احوال پرسی اور علاج کی ضرورت ہوتی ہے ۔اس ضرورت کو ہمارا ''دیسی'' معاشرہ ہنوز سمجھنے اور تسلیم کرنے سے شعوری یا لاشعوری طور پر لاچار ہی نظر آتا ہے۔ارباب اقتدارو اختیار کا تو پوچھیں ہی مت۔اکہتر برسوں سے یہ شتر مرغ ریت میں مسلسل اپنا سر چھپائے کھڑا ہے اور اس نے ایسا ہی رہنا ہے۔

ایسے میں انفرادی طور پر ہمیں خود یہ آگہی اور شعور حاصل کرنے کی ضرورت ہے کہ محض رسماً نہیں بلکہ خلوص (اور رازداری) کے ساتھ اپنے اردگرد موجود افراد سے ان کے ''اندر کا حال'' وقتاً فوقتاً دریافت کرتے رہا کریں۔اگر وہ کسی تشویش یا مسئلہ کا شکار ہیں تو ان سے تفصیلات جان کر درست سمت میں ان کی رہنمائی کرنا بطور انسان اور بطور مسلمان ہمارا فرض بنتا ہے۔ورنہ تو سوئے ہوئے بچے کا منہ چومنے کی طرح تصوراتی نظریاتی پن اور دوسروں سے ''غائبانہ'' قسم کی ہمدردی رکھنا بھی بے سود بلکہ لایعنی چیز ہے:

میرے پاس سے گزر کر میرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

یاد رہے کہ ہماری تعلیمات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی سے مسکرا کر اس کا حال پوچھ لینا بھی صدقہ ہوتا ہے۔اس میں کسی کافر مسلم کی تفریق نہیں۔محسنِ انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ساری زندگی اس صفت سے مزین رہی۔آپ فداہ امی وابی نے خود بھی اس پر عمل کیا اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی۔حقیقت تو یہ ہے کہ ہر لحاظ سے R.U.OK? کی تحریک آج سے پندرہ سو برس قبل اسلام نے ہی باضابطہ طور پر شروع کی تھی۔

قرآن کریم فرقان حمید کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک کسی ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کو بچانا ہوتا ہے۔اگر ہمارا ایک چھوٹا سا سوال ''آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟'' (R.U.OK?) کسی کی جان بچا لینے کا باعث بن سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کا اس سے آسان طریقہ اور کون سا ہوسکتا ہے؟۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

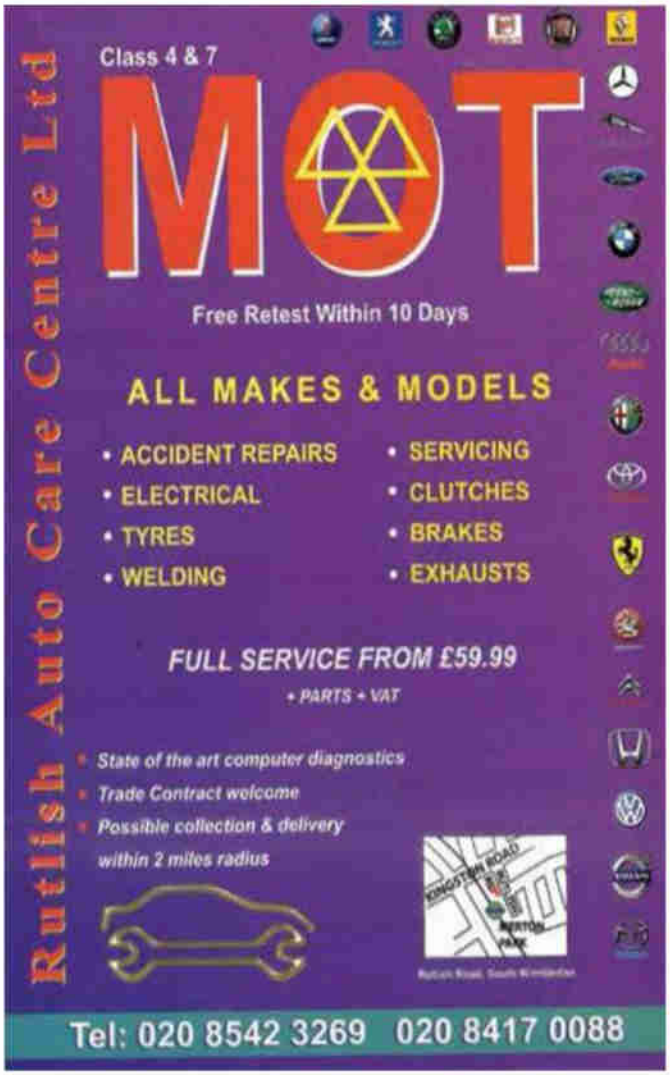

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لئے مختصر دورانیے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،.....ہو۔ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ..... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

ترقی کے چند اصول

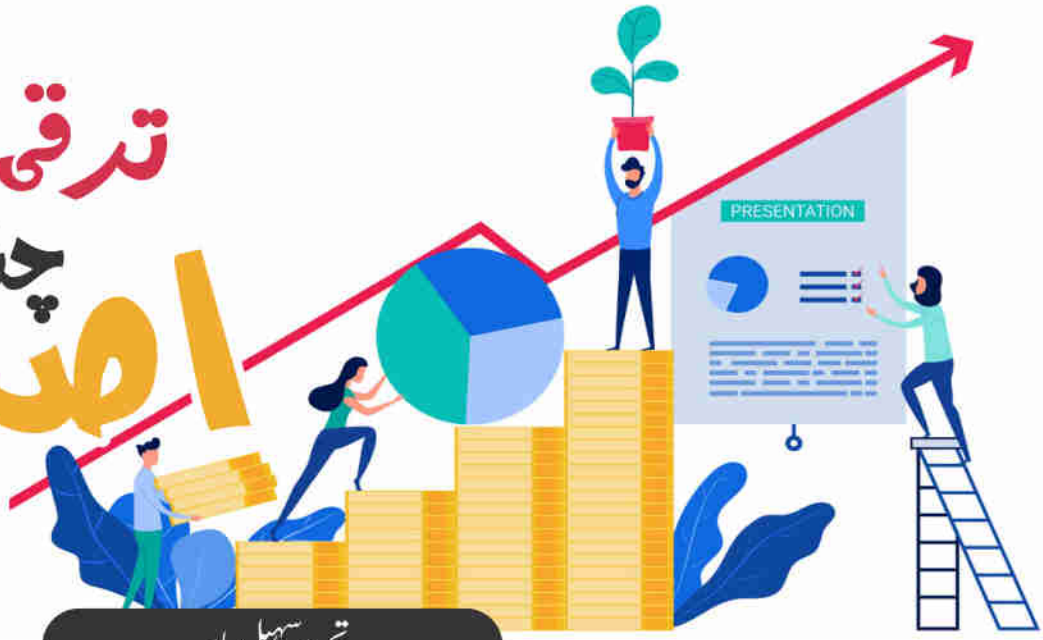

تحریر سہیل بابر

کامیاب، اصول پسند اور حقیقی رہنماؤں میں عام طور پر آٹھ خوبیاں یا خصوصیات پائی جاتی ہیں جو نہ صرف ان رہنماؤں کا کردار متعین کرتی ہیں بلکہ دیگر لوگوں کی ترقی کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوتی ہیں۔ یہ خوبیاں درج ذیل ہیں۔ علم کا مسلسل حصول ایک کامیاب رہنما زندگی بھر سیکھنے کے عمل سے گزرتا ہے اور مسلسل علم و آگہی کے حصول میں مگن رہتا ہے۔ وہ دنیا میں ہونے والی تازہ ترین تحقیق اور دوسروں کے تجربات سے مستفید ہونے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی آنکھوں اور کانوں کا بھرپور استعمال کرتا ہے۔ اسے سوال کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتی، وہ متجسس ہوتا ہے، اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرتا ہے اور اپنے علم کا دائرہ مشاہدات اور تجربات کے ذریعے وسیع کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ نئی مہارتیں اور نیا ہنر حاصل کرنے کے لیے سرگرم رہتا ہے۔ جب اس کے علم و آگہی کا دائرہ وسیع ہوتا ہے تو اس کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ پھر سیکھنے کے عمل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ خود ترغیبی کے نتیجے میں اس کی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ خدمت کے جذبے سے سرشار جو انسان حقیقی اور مخلص رہنما بننے کی لگن رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں، وہ ابتدا سے ہی خدمت خلق کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔ ان کے دن کا آغاز دوسروں کے لیے فکر کرنے سے ہوتا ہے۔ ایثار و قربانی ان کی نمایاں خوبی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ روزانہ خود کو دوسروں کے کام کے لیے تیار کرتے ہیں۔ جو کام ان کے سپرد کیا جائے وہ پوری توجہ اور جانفشانی سے کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر کام کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ دوسروں کے کام آنے کے لیے روزمرہ کی زندگی میں بہت سے میدان ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ آپ کوئی فلاحی تنظیم بنائیں۔ اگر ہم میں احساس ذمہ داری نہیں، خدمت خلق کا جذبہ نہیں تو پھر ہم زندگی میں جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں، وہ ایک لاحاصل سعی ہو گی۔ مثبت سوچ رہنماؤں کی نمایاں خوبیاں زندہ دلی، مثبت رویہ، خندہ پیشانی اور خوش مزاجی ہوتی ہیں۔ ان کا رویہ حوصلہ افزا اور پُرامید ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ تصویر کا روشن پہلو دیکھتے ہیں۔ ناامیدی، مایوسی اور حوصلہ شکنی انہیں قریب سے بھی چھو کر نہیں گزرتی۔ ان کا جذبہ بلند حوصلگی، جوش اور عزم سے بھرپور ہوتا ہے۔ یہ مثبت سوچ ان کے اردگرد کے ماحول پر بھی حاوی رہتی ہے اور ان کے قریب لوگوں کی سوچوں پر بھی مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ مثبت سوچ کے ذریعے، پریشان ہونے یا تصادم کی راہ اپنانے کے بجائے ایک امن پسند اور صلح جو کا کردار ادا کیا جائے تو منفی سوچ کے حامل افراد کی تباہ کاریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ دوسروں پر اعتماد دوسروں کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت سے آراستہ لوگ دوسروں کے غلط رویوں کو نظر انداز کر کے خوش دلی سے معاف کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کی خامیوں سے آگاہ ہوتے ہیں لیکن منفی رویوں اور تنقید سے گھبراتے نہیں ہیں اور نہ ہی کینہ اور بغض رکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کے بارے میں پہلے سے کوئی غلط رائے قائم نہیں کر لیتے بلکہ وہ اُن کے اَن دیکھے جوہر پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ بیج میں درخت دیکھنے اور بیج کے درخت بننے کے مراحل سے بخوبی آشنا ہوتے ہیں اور ان مراحل میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نظر آنے والی ٹھوس شے پر ہی یقین کیا جاتا ہے لیکن ہمیں غیر مرئی اور نظر نہ آنے والی خوبیوں اور صلاحیتوں پر یقین رکھنا چاہیے۔ متوازن زندگی دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بننے والے انسان سماجی طور پر فعال زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اچھی کتابیں پڑھتے ہیں، اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں اور گردوپیش کے واقعات و حالات سے باخبر ہوتے ہیں۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر فعال ہوتے

ہیں اور بہت سی دلچسپیاں رکھتے ہیں۔ گہرا مشاہدہ کرتے ہیں، نت نئی باتیں سیکھتے ہیں اور زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ خود پر ہنس سکتے ہیں مگر دوسروں کا مذاق نہیں اڑاتے۔ وہ اپنی قدر و قیمت سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس کی دیکھ بھال، حوصلے، جرأت اور خودداری سے کرتے ہیں مگر وہ ڈینگیں نہیں مارتے۔ وہ اپنے کارنامے سنا کر یا اپنی وابستگیوں کا اظہار کر کے دوسروں پر رعب نہیں جماتے۔ وہ اپنے مؤقف کا اظہار دوٹوک انداز میں کرتے ہیں اور مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہوئے۔ انتہا پسندی کے بجائے اعتدال کا راستہ اپناتے ہیں لیکن بہادری کے ساتھ برائی کی مذمت کرتے ہیں اور اچھائی کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ سازشوں اور جوڑ توڑ کے ذریعے اپنے کام نہیں نکالتے۔ وہ خلوص دل کے ساتھ دوسروں کی کامیابیوں پر خوش ہوتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ کسی محرومی کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہوتی ہے۔ وہ بہادر مہم جوؤں کی طرح ہوتے ہیں جو انجانی راہوں پر جانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ اتنے پُراعتماد ہوتے ہیں کہ آنے والے واقعات کے لیے متجسس ہوتے ہیں۔ انہیں نت نئی باتوں کا شوق ہوتا ہے۔ وہ آشنا چہروں اور پرانے مناظر کو اس طرح دیکھ رہے ہوتے ہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ انہیں سہاروں، پناہ گاہوں اور محفوظ ٹھکانوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خوف زدہ نہیں ہوتے اور مشکل صورت حال سے فرار کے بجائے اس کا سامنا بلند حوصلگی سے کرتے ہیں۔ وہ بڑے افسروں اور اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے مرعوب نہیں ہوتے اور کسی کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی راہ خود منتخب کرتے ہیں۔ وہ سخت گیر نہیں ہوتے بلکہ ان کے رویے میں لچک ہوتی ہے۔ انقلابی کردار وہ جس سے ملتے ہیں اس کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ جہاں جاتے ہیں وہاں صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ مؤثر طریقے سے کام کرتے ہیں۔ انہیں جو بھی صورت حال ملتی ہے وہ اس میں بہتری پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ اجتماعی کوششوں پر یقین رکھتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی کمزوریوں کو دور کر لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کی صلاحیتوں اور استعدادِ کار پر اعتماد کرتے ہیں اور اچھے نتائج کے لیے اختیارات سونپنے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ بدترین صورت حال میں بھی دوسروں سے بات چیت اور رابطے کرتے ہیں اور مناصب کے لیے لڑنے جھگڑنے کے بجائے دوسروں کے مفادات اور دلچسپیوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ ذاتی تجدیدِ نو وہ انسانی کردار کی ہمہ گیر صفات یعنی جسمانی، ذہنی، جذباتی اور روحانی کو بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی قسم کی جسمانی ورزش کے عادی ہوتے ہیں جو دل اور دورانِ خون کو صحت مند رکھتی ہے اور ان میں قوتِ برداشت اور قوتِ مزاحمت بڑھاتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے ذہنوں کو بیدار اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے مسلسل مطالعہ کرتے ہیں اور پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ دوسروں کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں اور جذباتی طور پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ روحانی سطح پر وہ عبادات اور مذہبی لٹریچر کے مطالعہ پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ ان تمام عادات سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ ان سرگرمیوں میں سے بیشتر تو روزمرہ کے معمولات میں بھی سرانجام دی جا سکتی ہیں۔ باقی سرگرمیوں کے لیے روزانہ کچھ وقت نکالنا پڑتا ہے لیکن یہی کوشش آگے چل کر بہت زیادہ وقت بچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ذاتی تجدید کے مندرجہ بالا اصول ایک مضبوط اور صحت مند شخصیت تشکیل دیتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کے قاتل نتھورام گوڈسے کا ہائی کورٹ میں دیا گیا اعترافی بیان میں نے گاندھی کو کیوں قتل کیا؟ نتھورام گوڈسے نے 5 مئی 1949 کو ہائی کورٹ میں اپنی پھانسی کی سزا سے پہلے، اس اعترافی بیان میں نہ صرف قتل پر فخر اور اطمینان کا اظہار کیا بلکہ اس کے درست ہونے کے دلائل بھی دیے۔ ہندو انتہا پسند تنظیم آر ایس ایس کے علمی شعبے سے منسلک نتھورام نے عدالت میں اقبالی بیان کی تیاری کے لیے اپنی تمام تصنیفی صلاحیتیں صرف کیں بیان سننے والے جج کے بقول یہ بیان اتنا جزباتی ہے کہ فیصلہ ججوں کے بجائے موجود حاضرین کو جیوری بنا کر کیا جاتا تو عین ممکن ہے اسے بری کر دیا جاتا۔ نریندر مودی کی حکومت نے گاندھی کے قاتل نتھورام گوڈسے کو ہیرو کے طور پر پیش کرنے لئے باقاعدہ مہم جاری رکھی۔ اس کے نام کا مندر، اس کے مجسمے کی تنصیب کے مطالبات، اس کی شخصیت پر فلم، ڈراموں اور کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ الگ سے ویب سائٹ کا اجراء مہم کا حصہ ہیں۔ ان تمام اقدامات پر بھارت میں حمایت اور مخالفت کا ردعمل جاری ہے۔ مہاتما گاندھی کے قاتل کا یہ اعترافی بیان، اپنی ہر دلیل اور اس میں پائی جانے والی مسلمانوں کے خلاف کھلی نفرت دو قومی نظریے کی براہ راست تصدیق ہے۔ اسے یہ بھی واضح ہوتا ہے قائداعظم نے پاکستان کیوں اور کس طرح کی مشکلات سے گزر کر بنایا۔ (اردو ڈائجسٹ جون 2019 کے شمارے

کیا آپ نہاتے ہوئے اپنی ٹانگیں دھوتے ہیں؟

(تحریر ذیشان محمود۔ پاکستان)

بظاہر یہ ایک مضحکہ خیز اور عجیب سا عنوان ہے! لیکن قارئین کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ گزشتہ دنوں سوشل میڈیا پر اس ٹوئیٹ کی دھوم رہی! اب تک ساڑھے 8 لاکھ سے زائد لوگ اس کو دیکھ چکے ہیں!

پہلے اس ٹوئیٹ پر نظر ڈالتے ہیں۔ کانر آرپ ویل (Conor Arpwel) نامی شخص جس کا تعلق واشنگٹن ڈی سی امریکہ سے ہے، نے اپنی ایک ٹوئیٹ میں لوگوں سے اس سوال کا جواب بصورت ایک سروے کی صورت میں طلب کیا۔

اس نے اپنی ٹوئیٹ میں کیا لکھا!

عام طور پر اس سوال کا جواب دینے کے بجائے آپ سے سوچیں گے کہ یہ کیا سوال ہے۔ جب نہانا ہے تو ٹانگیں تو دھوتے ہی ہوں گے۔ تو آپ کے لئے یہ بات واقعہ عجیب اور دلچسپ ہو گی کی اس سوال کا جواب دینے والے 782,52,8 لوگوں میں سے 20 فیصد لوگ نہاتے وقت اپنی ٹانگیں نہیں دھوتے۔ اور ان کے پاس اپنی اپنی دلیل بھی ہے۔

ایک صاحب کا جواز یہ ہے کہ ان کی ٹانگیں سارا دن پتلون میں محفوظ اور صاف رہتی ہیں تو انہوں ٹانگیں دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ حالانکہ ان کی اس ٹوئیٹ کے جواب میں لوگوں نے ان کو یاد کرایا کہ ان اوپری جسم بھی شرٹ کے اندر رہتا ہے۔ تو پھر وہ اسے کیوں دھوتے ہیں؟

ایک صاحبہ کہتی ہیں کہ وہ صرف تب ٹانگیں دھوتی ہیں اگر ان کی ٹانگیں ڈھکی نہ ہوں، یا پھر وہ جم گئی ہوں۔ وہ ٹانگیں دھویا کرتی تھی لیکن 'ایکزیما' کی وجہ سے صابن کا استعمال بند کرنا پڑا۔ صابن آپ کی جلد کے لیے مفید نہیں اور نہ ہی ضروری ہے۔

ایک اور صاحبہ نے 2017ء میں شائع ہونے والے ایک آرٹیکل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ وہ نہیں دھوتی (اگر وہ ٹانگیں شیو نہ کر رہی ہوں تو)، اور انہیں لگتا ہے کہ وہ صحیح ہیں اور پر اعتماد ہیں کہ ان کی جلد کا اپنا قدرتی تیل محفوظ ہے۔

ایک صاحب نے تو کہا کہ اس ٹوئیٹ پر تیسری دفعہ تبصرے پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے لمبا غسل کیا۔ اور لوگوں کی دی گئی ٹپس کو انہوں نے آزما کر ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔

ایک صاحب تو ابھی تک اس سوال پر گہری سوچ میں ہیں کہ کوئی نہاتے وقت اپنی ٹانگیں کیوں نہیں دھوئے گا۔

بہر حال یہ تو عام عوامی رائے اور تبصرہ جات تھے۔ اب آپ کو نہانے یا غسل کرنے کا مسنون طریقہ بھی بتاتے چلیں!

غسل کا مسنون طریق

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غسل کرنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت کرتے تو پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر استنجاء کرتے، اس کے بعد مکمل وضو کرتے، پھر پانی لے کر سر پر ڈالتے اور انگلیوں کی مدد سے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچاتے، پھر جب دیکھتے کہ سر صاف ہو گیا ہے تو تین مرتبہ سر پر پانی ڈالتے، پھر تمام بدن پر پانی ڈالتے اور پھر پاؤں دھو لیتے۔''

(مسلم 1:253، رقم:316)

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت غسل جنابت فرماتے تو دودھ کے ڈول جتنا برتن منگواتے، آپ اسے اپنی ہتھیلی سے پکڑ لیتے اور اپنے سر کی دائیں جانب سے شروع کرتے پھر بائیں جانب ڈالتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سر پر ڈالتے۔''

(بخاری:258، مسلم:318)

ان دو احادیث کو پڑھ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غسل کے لئے طہارت و وضو کے بعد تمام بدن (بشمول ٹانگوں) پر پہلے دائیں اور پھر بائیں پانی بہانا ہی مسنون طریق ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ضروری نہیں کہ ایک حصہ جسم تو دھویا جائے کہ وہ گندہ ہو گیا تھا اور ایک نہ دھویا جائے کہ وہ صاف ہی رہا۔ یہ پاکیزگی حاصل کرنے کا عبث خیال ہے۔

بہائیت اور اسلام

تحریر عبدالباسط شاہد

تیرھویں صدی ہجری میں ایران میں ایک عجیب وغریب تحریک پیدا ہوئی جس کی بنیاد محض اوہام باطلہ پر تھی نہ کسی الہامی کتاب پر۔ اس جدید خیال کے متبعین کو بابی یا بہائی کے نام سے پکارا جاتا ہے چونکہ اس جدید خیال کو پیش کرنے والے مسلمانوں کے فرقہ شیعہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے عوام الناس اس تحریک کو مسلمانوں کا ایک نیا فرقہ سمجھتے رہے۔ حالانکہ بہائیت کو اسلام سے دور کی بھی نسبت نہیں۔

اسلام میں ایک وراء الوریٰ لطیف ہستی کو خدا اور معبود سمجھا جاتا ہے جو اس کارخانۂ عالم کا خالق ہے۔ اور جس کی قدرتیں اور طاقتیں غیر محدود ہیں۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ غرض کہ مسلمانوں کا خدا وہ عظیم الشان ہستی ہے جو جمیع صفات کاملہ سے متصف ہے۔ لیکن بہائیوں کے نزدیک ایک ضعیف اور کمزور انسان میرزا حسین علی المقلب بہ بہاء اللہ جس کو تمام بشری کمزوریاں لاحق تھیں، خدا تھا۔ چنانچہ رسالہ ''طرازات'' میں مرزا حسین علی نے خود اپنی نسبت لکھا ہے۔ انی انا اللہ لا الہ الا انا المھیمن القیوم، اس ایک امر سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ بہائیت کو اسلام سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی امور سے بہائیت کا اسلام سے قطعی جدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بہائیوں کے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو لیجئے۔

بہائیوں کی نماز

قرآن مجید میں حکم ہے فول وجھک شطر المسجد الحرام کہ بوقت نماز مسجد حرام کی طرف منہ کیا جائے لیکن اس کے بالکل برعکس بہائیوں کی شرعی کتاب اقدس میں حکم ہے:

اذا اردتم الصلوٰۃ فولوا وجوھکم منظری الاقدس مقام القدس

یعنی جب نماز کا ارادہ کرو تو میری جانب رخ کرو (یعنی مرزا حسین علی کی طرف) اور اپنے مرنے کے بعد اپنی قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

''قبلہ ما اہل بہا روضہ مبارک است در مدینہ اکادر وقت نماز خواندنی بائد رو بروضہ مبارک ہاسیقم''۔ (دروس الدیانت درس صفحہ ۱۹)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قبلہ مرزا حسین علی کی قبر ہے۔ اور اس میں صریح غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے کہ مذکورہ قبر شہر نکا میں ہے۔ (حالانکہ یہ قبر عکہ نامی ایک قصبہ میں ہے) نماز کے متعلق بہائیوں کو حکم ہے کہ قد کتب علیکم الصلوٰۃ تسع رکعات'' کہ تم پر صرف 9 رکعت نماز فرض ہے۔ جو اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ بہا اللہ نے شریعت اسلامی کے خلاف شرعی احکام ایجاد کئے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی نماز میں اسلامی نماز کے ارکان والفاظ کی بجائے بہاء اللہ کے بیان کردہ طریق اور دعائیں ہیں۔

بہائیوں کے روزے

روزوں کے متعلق بھی بہاء اللہ نے سراسر خلافِ اسلام احکام جاری کئے ہیں۔ چنانچہ بجائے ماہ رمضان کے 29 یا 30 دن روزہ رکھنے کے بہائی شریعت کی رو سے صرف ماہ علاء (تقویم بہائی) کے 19 روزے ہیں۔ جیسا کہ دربارہ احکام میں لکھا ہے کہ:

''قد کتبنا علیکم الصوم تسعۃ عشر یوما''

مندرجہ بالا تبدیلی کے علاوہ ایک اور زبردست اختلاف دربارہ احکام روزہ یہ ہے کہ بجائے طلوع فجر سے غروب آفتاب تک روزہ رکھا جائے چنانچہ ''اقدس'' میں ہے کہ:

''کفر اانفسکم عن الی الغروب من الطلوع الی الاقول''

روزوں کے احکام میں بھی نماز کی طرح مریض مسافر حائضہ کو روزے بالکل معاف ہو جاتے ہیں (حالانکہ اسلامی حکم عذر دور ہونے پر فوت شدہ روزے پورے کرنے کا ہے) کتاب ''اقدس'' میں احکامات روزہ کے ضمن میں ہے کہ ''لیس علی المسافر والمریض'' روزوں کے متعلق مندرجہ بالا بہائی احکامات سے بدرجہ اتم معلوم ہو جاتا ہے کہ شریعت بہائیہ شریعت اسلامیہ کے بالکل خلاف ہے۔

بہائیوں کا حج کعبہ

بہائیوں کو حج کعبہ کی بھی ضرورت نہیں بلکہ اس کے برعکس علی محمد باب اور میرزا حسین علی کے مکانات کا طواف ہی حج ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لئے بہائیوں کی کتب میں متعدد حوالہ جات ملتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

''محل طواف وحج اہل بہا یکے بیت نقطہ اولیٰ (علی محمد باب۔ ناقل) در شیراز است وثانی این بیت جمال الٰہی (میرزا حسین علی۔ ناقل) در بغداد است''

(الکواکب ماثر البہائیہ صفحہ 358)

حج کے احکامات میں بھی عورتوں سے بلاوجہ غیر معمولی نرمی برتی گئی ہے اور ان کو مندرجہ بالا مقامات کا حج وطواف معاف ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

''قد حکم اللہ لمن استطاع منکم حج البیت دون النساء عفاء اللہ عنھن''۔ (اقدس)

بہائیوں کی زکوٰۃ

زکوٰۃ کے متعلق بہائیوں کے مبہم اور غیر واضح احکام ملتے ہیں۔ بہاء اللہ نے زکوٰۃ کو فرض تو قرار دیا ہے اور اس کی ادائیگی کا بھی حکم دیا ہے لیکن اس کا کوئی نصاب مقرر نہیں کیا۔ ہاں ''اقدس'' میں بہاء اللہ کا دعویٰ ہے کہ وہ زکوٰۃ کا نصاب کسی جگہ بیان کرے گا۔ نامعلوم بہاء اللہ کس وقت اور کس موقع کی انتظار میں تھا اور اس کو نصاب زکوٰۃ بیان کرنے میں کیا چیز مانع ہوئی بہر حال بہاء اللہ نے نصاب مقرر کرنے کا وعدہ کسی جگہ ایفا نہیں کیا۔ زکوٰۃ کے متعلق بہاء اللہ کا حکم مندرجہ ذیل ہے:

کتب علیکم تزکیۃ الاقوات وما دونھا بالزکوۃ ھذا ما حکم بہ منزل الایات فی ھذا الرق المنیع سوف ننصل لکم نصابھا''

(اقدس)

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ میرزا حسین علی کی زندگی میں زکوٰۃ کی وصولی کا حق ان کو حاصل تھا اور اس کے بعد اس کی اولاد کو۔ لیکن اگر ان کی اولاد نہ ہو تو زکوٰۃ ''بیت العدل'' کو ادا کی جائے۔

''بیت العدل'' کے وصولی زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی بہت سے کام بیان کئے گئے ہیں لیکن آج تک ''بیت العدل'' قائم نہیں ہو سکا۔

مسلمانوں کے لئے ان کے فریب سے بچنے میں سب سے بڑا اشکال یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی رسوم کے نام اسلامی عبادات کے اسماء سے لئے ہیں۔ حالانکہ ان ناموں کو اسلامی عبادات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا چند مثالوں سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

ایک اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ بہائیوں نے اپنی شرعی کتب کو کسی جگہ بھی مشتہر اور عام نہیں کیا۔ اس لئے بہائی بہاء اللہ کے حکم علیکم بالتقیۃ کہ بہائیوں پر تقیہ واجب ہے، سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بہائیوں کے مبلغ و داعی جس قسم کے لوگوں میں جاتے ہیں اپنے آپ کو ویسا ہی ظاہر کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں یہ لوگ مسلمان بن کر رہتے ہیں لیکن عیسائیوں میں عیسائی اور یہودیوں میں یہودی بن جانا ان کے لئے معمولی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ کسی ایسے بہائی کی کتاب کا مطالعہ کریں جو اپنی بدقسمتی سے مسلمانوں میں سے بہائی ہوا ہو تو یوں معلوم ہوگا کہ بہائیت اسلام کا چربہ ہے۔ لیکن اگر کسی ایسے بہائی کی کتاب پڑھی جائے جو عیسائیوں میں سے بہائی ہوا ہو تو بہائیت دین عیسوی کا چربہ اور نقل معلوم ہوتی ہے۔ مسیحیوں کے تثلیث وکفارہ قسم کے مسائل آپ کو ان کتابوں سے مل سکیں گے۔ اور جو شان مسیحی عیسیٰ علیہ السلام کی قرار دیتے ہیں وہی شان مرزا حسین علی کی بیان کی گئی ہوگی۔ وعلیٰ ھذا القیاس۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسے لوگوں کو جو کسی وجہ سے ان کے قریب آجائیں حقیقت حال سے آگاہ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو تقیہ کی آڑ میں رکھتے ہوئے دام بہائیت میں پھنسا لیا جاتا ہے ورنہ تہذیب وتمدن کے اس دور میں کون ایسے عقائد مان سکتا ہے جس میں ایک شخص (جس کو تمام بشری کمزوریاں لاحق تھیں) کو سجدہ کرنا بھی شامل ہو۔

Lahore International Magazine

Instagram: @lahoreintl
Twitter : @lahoreintl
Facebook: lahoreinternational
YouTube: lahoreinternational
Google+: lahoreintl
Contact: +447940077825
Whatsapp: +447940077825
Email: lahoreintlondon@gmail.com

اُمت پر تری آکے عجب وقت پڑا ہے

تحریر امۃ الباری ناصر

حضرت محمد مصطفی ﷺ کے اسوہ حسنہ کے مطالعہ سے انسان دوستی کے ایسے دلنشیں واقعات نظر آتے ہیں کہ دل عش عش کر اُٹھتا ہے ۔ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم خیر البشرؐ خاتم الانبیاءؐ خیر الرسلؐ کی اُمت ہیں۔آخری صاحب شریعت نبی جس کے ہاتھ پر مولا کریم نے دین اسلام مکمل کر دیا۔کسی دوسرے مذہب میں حسن اخلاق کی ایسی کامل تعلیم اور اس پر عمل کی ایسی مکمل مثال نہیں ملتی آپؐ کے اخلاق قرآن کی تفسیر ہیں۔انسان کے لیے صراط مستقیم کے رہنما ہیں۔

آپ چل کے تونے دکھلادی رہِ وصلِ حبیب
تونے بتلایا کہ یوں ملتا ہے یارِ بے نشاں

ایک حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا 'اللہ تعالی نے مجھ کو مکارم اخلاق اور محاسن افعال کا اتمام کرنے کے لیے مبعوث فرمایا ہے'

(مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین۔الفصل الثانی)

آج آپؐ کی اُمت میں آپؐ کے اخلاق کا عکس کم ہی نظر آتا ہے حُب رسولؐ کے دعوے کرنے والوں نے دین کو اپنی سہولت کے مطابق توڑ مروڑ لیا ہے۔بہت سے حلقے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ گیا ہے۔یہ بھی مانتے ہیں کہ حالت اتنی خراب ہے گویا خدا تعالیٰ نے امت سے اپنی حمایت کا ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ہم آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں کہ ہر دن پہلے سے بدتر آتا ہے۔آسمانی اور زمینی آفتوں نے راستہ دیکھ لیا ہے۔علماء اور عوام ایک آواز ہو کر اس بے برکتی کو خدا کا قہر' ناراضگی اور عذاب کہہ رہے ہیں۔مگر یہ نہیں سوچتے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا:(بنی اسرائیل:۱۵) ور ہم ہرگز عذاب نہیں دیتے یہاں تک کہ کوئی رسول بھیج دیں (اور حجت تمام کر دیں)۔

اس زمانے میں بھی ایک نذیر آیا۔اُس نے آگاہ کیا کہ زندہ خدا۔زندہ قرآن اور زندہ رسولؐ سے تعلق جوڑو ورنہ مولا کریم غنی ہے۔وہ نافرمانوں کی بستیاں اُلٹا دیتا ہے۔وہ نئے زمین و آسمان پیدا کرنے پر قادر ہے۔وہ افراد کی غلطیوں سے صرف نظر کر لیتا ہے مگر اجتماعی گناہوں پر پکڑ ضرور آتی ہے۔وہ بہت دفعہ جھنجھوڑتا ہے زلزلے آتے ہیں طوفان آتے ہیں قتل و غارت گری، آگیں، دہشت گردی، بم دھماکے، بدامنی 'بے حیائی' بے ایمانی 'خوف 'بیماریاں' ایک دوسرے کی گردن مارنا' کبھی ایک ملک دوسرے پر حملہ کر کے زبردست تباہی پھیلانا۔یہ آفات و مصائب بندے کو غفلت سے بیدار کرنے کے لیے آتے ہیں تاکہ بندے ان سزاؤں کو دیکھ کر خدا کی طرف جھکیں۔بداعمالی چھوڑ دیں۔بار بار کی ڈھیل اور تنبیہ کے بعد پھر اُسے ایسے نافرمان لوگوں کی ضرورت نہیں رہتی۔وہ ان کی طرف سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔کتنی قوموں کا قرآن میں ذکر ہے جن کے نام و نشان مٹا دیئے گئے۔

اللہ پاک نے کوئی زمانہ اور کوئی علاقہ منادی کے بغیر نہیں چھوڑا۔ہمارے پیارے نبی ﷺ جو اُمت سے بے حد محبت کرتے تھے۔راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اُمت کے لئے اس قدر دعا کرتے کے سجدہ گاہ تر کر دیتے تھے۔آپ نے اپنی امت کو اللہ کے قہر سے بچانے کے لیے واضح طور پر بتایا تھا۔کہ اجتماعی طور پر اخلاقی تنزل' ناانصافی اور بے ایمانی اللہ پاک کا غضب بھڑکا دیتی ہے۔آپؐ کی احادیثِ مبارکہ سے اختصار کے ساتھ اللہ پاک کے غضب کو بھڑکانے والے اجتماعی جرائم اور ان کی سزائیں درج ذیل ہیں۔

1۔جب کسی قوم میں فحش اور بدکاری اعلانیہ ہونے لگے تو لوگ طاعون اور ایسی ہی دوسری دردناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن سے پہلے لوگ ناواقف تھے۔

2۔جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگے تو وہ قحط سالی۔بدحالی۔اور حکومت کی زیادتیوں کی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

3۔جب کوئی قوم زکوۃ کی ادائیگی نہیں کرتی تو اُس سے بارش روک لی جاتی ہے۔اگر جانور اور مویشی نہ ہوں تو ایک قطرہ بھی نہ برسے۔

4۔جب کوئی قوم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ عہد شکنی کی مرتکب ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان پر دشمن کو مسلط کر دیتا ہے جو ان سے ہر چیز چھین لیتا ہے۔

5۔جب ملک کے حکمران احکام خداوندی کے مطابق کاروبار حکومت چلانا ترک کر دیں تو اللہ اس قوم میں پھوٹ ڈال دیتا ہے پھر لوگ افتراق اور انتشار کا شکار ہو کے رہ جاتے ہیں۔

ایک اور حدیث ہے۔ قیامت کی گھڑی یا زوال اُمت کی نشانی بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا جب نا اہل اور غیر مستحق لوگوں کے سپرد اہم کام کئے جائیں گے یعنی اقتدار بد دیانت اور نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گا تو اپنی بد دیانتی اور فرض ناشناسی کی وجہ سے قوم کو برباد کر دیں گے۔ اسی طرح آپؐ نے بربادی کی علامتیں بیان فرمائیں علم ختم ہو جائے گا۔ زنا بکثرت پھیل جائے گا شراب عام پی جائے گی مرد کم ہو جائیں گے اور عورتیں بچ رہیں گی جس کی وجہ سے پچاس پچاس عورتوں کا ایک ہی نگران اور سرپرست ہوگا' زلازل کی کثرت ہوگی۔ وقت قریب ہوتا محسوس ہوگا۔ قتل و غارت گری عام ہوگی۔ لوگ بلند تر عمارات بنانے لگیں گے۔ چاشت کے وقت ایک عجیب و غریب کیڑا لوگوں پر مسلط ہوگا۔ مساجد بظاہر آباد مگر ہدایت سے خالی ہونگی۔ ان کے علماء آسمان کے نیچے بسنے والی مخلوق میں سے بدترین مخلوق ہوں گے۔ ان میں سے فتنے اُٹھیں گے اور ان میں ہی لوٹ جائیں گے۔ نیز فرمایا۔

میری اُمت پر اضطراب اور انتشار کا زمانہ آئے گا لوگ اپنے علماء کے پاس رہنمائی کی اُمید سے جائیں گے تو وہ اُنہیں بندروں اور سوؤروں کی طرح پائیں گے۔ یعنی علماء کا اپنا کردار انتہائی خراب اور قابل شرم ہوگا۔

ایک علامت یہ بیان فرمائی کہ علم اُٹھ جائے گا لوگ دیکھیں گے کہ عالم نہیں رہے تو جاہلوں کو سردار بنالیں گے اور ان سے جا کر مسائل پوچھیں گے وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

امت کی بدحالی کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ بنی اسرائیل سے مشابہ ہو جائے گی فرمایا:

میری اُمت پر بھی وہ حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے جن میں ایسی مطابقت ہوگی جیسے ایک پاؤں کے جوتے کی دوسرے پاؤں کے جوتے کی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں سے بدکاری کا مرتکب ہوا تو میری امت میں بھی کوئی بدبخت ایسا نکل آئے گا بنی اسرائیل 72 فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی لیکن ایک فرقے کے سوا باقی سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا یہ ناجی فرقہ کون سا ہے تو حضورؐ نے فرمایا وہ فرقہ جو میری اور میرے صحابہؓ کی سنت پر عمل پیرا ہوگا۔

ان علامات کو پڑھتے ہوئے ہر علامت پر دل کہتا ہے کہ اصدق الصادقین حضرت محمد مصطفی ﷺ کی یہ احادیث مبارکہ بعینہ پوری ہو رہی ہیں۔ جب یہ سب علامات آنکھوں کے سامنے سچی ثابت ہو رہی ہیں تو جو طریق اصدق الصادقینؐ نے اپنا دین و ایمان اور جان بچانے کے لیے ارشاد فرمایا تھا وہ بھی تو درست ہے۔

وہ طریق یہ ہے۔ 'جو میری اور میرے صحابہؓ کی سنت پر عمل پیرا ہوگا'۔ ہم اپنے نبیؐ ﷺ کی سنت سے کتنے باخبر ہیں؟ کیا کوشش کرتے ہیں یہ معلوم کرنے کی کہ ہمارا طرز عمل نبی جی ﷺ کے طرز عمل کے مطابق ہے یا نہیں۔ کیا ہم نے قرآن پاک اور سیرت نبوی کا خود مطالعہ کیا یا ہمارے علم کا مدار ایسے لوگوں پر تھا جو عالم باعمل ہوں۔ سچے دل سے دین کے احکام کی اطاعت کرنے والے ہوں۔ یہی تو راستہ ہے جس سے اللہ تبارک تعالی کا پیار اور محبت پا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

قُل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِی یُحبِبکُمُ اللّٰہُ وَ یَغفِرلَکُم ذُنُوبَکُم ؕ وَ اللّٰہُ غَفُورٌ رَّحِیم (۳:۳۲)

اور نبی کریم ﷺ کی زبان سے پیغام دیا ہے کہ خلق اللہ کو بتا دیں کہ اگر اللہ کی محبت چاہئے تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور غلطیاں معاف کر دے گا وہ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُولِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِمَنْ کَانَ یَرْجُو اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیرًا (الاحزاب ۲۲)

یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول میں نیک نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔

آپؐ کے اسوہ پر چلنے کے لیے آپؐ کی پیروی کرنے کے لیے آپؐ کی سیرت و سوانح کا جاننا ضروری ہے۔ قرآن پاک اس کا بہترین ماخذ ہے پھر مستند سنت 'احادیث اور سیرت کی کتب پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ مکارم اخلاق کی کتنی بلند ترین چوٹیوں پر فائز ہیں۔ کچھ تو اس دور کے علمائے سوء نے بے بہرہ رکھا اور کچھ دشمنانِ دین نے۔ نتیجہ یہ کہ انسان گھاٹے میں چلا گیا۔

دشمنان اسلام کو یہ راز پتا ہے کہ اگر مسلمان اپنے رسول ﷺ اور قرآن سے رہنمائی لیں گے تو طاقت ور ہو جائیں گے اس لیے ہر طریق سے انہیں دین سے بدظن اور بے بہرہ رکھنے کے طریق اختیار کیے جاتے ہیں۔ دین کو مذاق بنانے کے لیے کبھی رسولِ کریم ﷺ کے کارٹون شائع ہوتے ہیں کبھی شریعہ لاء کا ناقابل عمل ہونا ثابت کیا جاتا ہے۔ کبھی غلط ترتیب دیا ہوا قرآن چھپ کر آجاتا ہے۔ کبھی پردہ پر اعتراض ہوتا ہے کبھی مساجد کے مناروں پر غصہ اُترتا ہے۔ یہ اتفاقی حادثے نہیں ہیں یہ بڑی سوچی سمجھی سازشیں ہوتی ہیں ان کے لیے وقت کا تعین بھی منصوبہ بندی سے کیا جاتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا ان میں کوئی لیڈر شپ' کوئی طاقت اُبھر رہی ہے؟ جب چند شہروں میں احتجاج کرنے والے اپنا جوش دکھا کر اپنے بھائی بندوں کی دوکانوں اور ٹھیلوں کو جلا کر بینرز کے ساتھ جلوس

نکال کر عمارتیں اور بازار اور پتلے جلا کر ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں تو دشمن کو اپنے ہی سر پر خاک ڈالنے والوں کی نا طاقتی کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسلام کی حمایت میں کوئی اجتماعی آواز نہیں اٹھتی تو اگلی نسلیں اسلام کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے لگتی ہیں۔

اگر کہیں سے منظم اور مؤثر آواز اُٹھتی ہے تو جماعت احمدیہ ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فوراً پوری طاقت سے اسلام کا دفاع کرتے ہیں۔ پہلا ہتھیار یہ ہوتا ہے کہ احباب جماعت کثرت سے درود شریف پڑھیں اور رسولِ پاک ﷺ کے اسوہ حسنہ کی خوبصورتی دنیا کو دکھانے کے لئے تحریر و تقریر سے کام لیں۔ پھر امن اور بین المذاہب کانفرنسیں منعقد کروائیں اور ایسا لٹریچر شائع کروائیں جو دنیا کو ہمارے پیارے نبی کا اصلی حسن دکھا سکے۔ وہ حسن جو دنیا کو اسی طرح مسحور کر دے جیسے صحرائے عرب میں کیا تھا اور سب آپؐ کے عشق کے اسیر ہو جائیں۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

ہم رسول پاکؐ سے اسقدر محبت کریں کہ پیارے آقا کی تصویر بن جائیں۔ آپؐ کے اسوہ کو اپنا کر چھوٹے چھوٹے محمدؐ بن جائیں آپ کا حسن ہماری ذات میں نظر آئے اور ہمیں دیکھ کر دنیا اسلام کی طرف راغب ہو۔ ہمارے ہاتھ میں محمد ﷺ کا علم ہو اور ساری دنیا اُس کے نیچے آرام و سکون کے لئے آ جائے۔ یہ وقت ہے پوری قوت سے خدا کی رسی کو پکڑنے کا۔ خدا کے آگے جھکنے کا، اُس کی آخری ہدایت قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑنے کا۔ اُس سے چمٹ جانے اور اپنی اولادوں کو اس سے جوڑنے کا۔ دین کا اتنا علم ہو کہ اپنے نبی جیؐ پر آنچ نہ آنے دیں۔ یہ الٰہی کتاب روئے زمین پر اکمل ترین منشور مکمل ضابطہء حیات ازلی ابدی قانون ہے۔ دنیا کا کوئی قانون کوئی آئین ایسا نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے۔ کوئی دوسری مذہبی کتاب نہیں جو ابدی حقائق رکھتی ہو۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اس نے نظر انداز کیا ہو۔ اسی میں ہر مرض کا علاج اور ہر مسئلے کا حل ہے۔

موجودہ دور کی قباحتوں یعنی دجالی فتنوں سے بچنے کے لئے رسولِ پاک ﷺ نے تلقین فرمائی تھی سورۃ الکہف کی ابتدائی دس آیتیں اور آخری دس آیتیں پڑھیں۔ (مسند احمد بن حنبل جلد 6)۔ ان آیات کا مفہوم یکجا ایک عنوان کے تحت لائیں تو ایسی اقوام کا ذکر ہے جو انسان کو خدا کا رتبہ دیتی ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف سے غافل کر کے دنیاوی لذات کا دیوانہ بناتی ہیں۔ اُن کے علم سائنس اور وسائل انسانیت کی تباہی کے نت نئے ہتھیار ایجاد کرنے اور تعیش کے تباہ کن سامان بنانے میں صرف ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دوکان چلانے کے لئے مسلمانوں کو آپس میں الجھائے رکھتے ہیں۔ معصوم بچوں کو دکھائے جانے والے کارٹون اور وڈیو گیمز میں بھی کئی طرح کے زہر رکھتے ہیں جو غیر محسوس طور پر اُن میں سرایت کرتے ہیں۔ افسوس ہماری مسلمان تنظیموں، حکومتوں اور علماء کے پاس ان آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی اجتماعی صورت نہیں۔ یہ وقت ہے پوری قوت سے خدا کی رسی کو پکڑنے کا۔ خدا کے آگے جھکنے کا، جماعت احمدیہ نے آنحضرت ﷺ کی تعلیمات آپ کے پیغام امن کو سینے سے لگا کر ایسے عملی اقدامات کئے ہیں جن سے انسانیت کی اجتماعی بہتری کے سامان ہو رہے ہیں۔ گویا ہماری جماعت کو خدا تعالیٰ کا فضل سے Love For All Hatred For None کا نعرہ لگانے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔ دعوت الی اللہ دعوت الی الخیر ہر انسان کے لئے ہے تعلیم اور طب کی سہولتیں دینے کے لئے ادارے بنائے جا رہے ہیں۔ یتیموں، بیواؤں، مسکینوں ناداروں قیدیوں سے حسن سلوک کی منظم کوشش ہوتی ہے۔ Humanity first خدمت انسان میں مصروف ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہاں اُمت مسلمہ اور کل بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے دعائیں ہوتی ہیں۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

''مَیں بار بار لکھ چکا ہوں کہ یہ شدید آفت جس کو خدا تعالیٰ نے زلزلہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے صرف اختلافِ مذہب پر کوئی اثر نہیں رکھتی اور نہ ہندو یا عیسائی ہونے کی وجہ سے کسی پر عذاب آ سکتا ہے اور نہ اس وجہ سے آ سکتا ہے کہ کوئی میری بیعت میں داخل نہیں۔ یہ سب لوگ اِس تشویش سے محفوظ ہیں۔ ہاں جو شخص خواہ کسی مذہب کا پابند ہو جرائم پیشہ ہونا اپنی عادت رکھے اور فسق و فجور میں غرق ہو اور زانی، خونی، چور، ظالم اور ناحق کے طور پر بداندیش، بدزبان اور بدچلن ہو اُس کو اس سے ڈرنا چاہیئے اور اگر توبہ کرے تو اُس کو بھی کچھ غم نہیں اور مخلوق کے نیک کردار اور نیک چلن ہونے سے یہ عذاب ٹل سکتا ہے۔ قطعی نہیں ہے۔'' (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۹۷)

اس دور خرابی سے پہلے کہ طوفان ہمیں بہا کر لے جائے صدق سے خلوص سے توبہ کر کے کشتی نوح میں بیٹھ جائیں۔ صرف اسی صورت میں خدا تعالیٰ کی حفاظت میں آ سکتے ہیں۔ الطاف حسین حالی نے اس اُمت کے لئے بڑے درد سے دعا کی تھی:

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن

دل دادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تری کے مقبول خدا ہے

آخر میں آنحضور ﷺ کی ایک دعا کا ترجمہ حاضر ہے۔

'اے اللہ تو ہمیں اپنا خوف عطا فرما جسے تو ہمارے گناہوں کے درمیان روک بنا دے اور ہم سے تیری نافرمانی سرزد نہ ہو اور ہمیں اطاعت کا وہ مقام عطا کر جس کی وجہ سے تو ہمیں جنت میں پہنچا دے اور اتنا یقین بخش کہ جس کی وجہ سے دنیا کے مصائب کو ہم پر آسان کر دے۔

اے میرے اللہ ہمیں اپنے کانوں اپنی آنکھوں اور اپنی طاقتوں سے زندگی بھر صحیح صحیح فائدہ اُٹھانے کی توفیق دے اور ہمیں بھلائی کا وارث بنا اور جو ہم پہ ظلم کرے اس سے تو ہمارا انتقام لے جو ہم سے دشمنی رکھتا ہے اُس کے خلاف ہماری مدد فرما اور دین میں کسی ابتلا کے آنے سے بچا اور ایسا کر کہ دنیا ہمارا سب سے بڑا غم اور فکر نہ ہو یعنی ہماری پہنچ صرف دنیا تک ہی محدود نہ ہو ایسے شخص کو ہم پر مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کرے اور مہربانی سے پیش نہ آئے'۔۔آمین یارب العالمین۔

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لئے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

کالم

فضل الرحمن کھوکھر۔ایڈیٹر لاہور انٹرنیشنل

3 اکتوبر ایک تاریخ ساز دن

تین اکتوبر دنیا میں دیوار برلن کے اختتام کے طور پر منایا جاتا ہے، جواب ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ مؤرخہ 3 اکتوبر 1988 کو مشرقی جرمنی نے مغربی جرمنی کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا اور جرمن قوم نے اپنی عظمت کا ثبوت دکھاتے ہوئے جدید دنیا میں ایک بار پھر نئی تاریخ رقم کر دی۔ جرمن قوم ایک اس دن کو بہت تزک و اہتمام کے ساتھ مناتی ہے اور اس دن قومی رخصت ہوتی ہے۔ روائیتی طور پر اس دن بہت سی کمپنیاں اور تنظیمیں اپنے دروازے عوام کے لیئے کھول دیتی ہیں اور یہ اپنے تعارف کے لیئے مختلف پروگرام منعقد کرتی ہیں، جن میں اہم سیاسی و سماجی شخصیات بھی شرکت کرتی ہیں۔ 3 اکتوبر کے دن بہت سی مساجد کی انتظامیہ بھی جرمنوں اور جرمنی میں بسنے والی مختلف اقوام میں اسلام متعارف کروانے اور اسلام کے متعلق پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے ازالے لیئے خصوصی پروگراموں کا اہتمام کرتی ہیں۔ ان میں خاص اہمیت کے پروگرام جرمنی کی سب سے پرانی مساجد فرانکفرٹ میں مسجد نور اور ہامبرگ میں مسجد فضل عمر میں منعقد کیئے جاتے ہیں اور جرمنی کے دارالحکومت برلین میں قریبا دس سال پہلے بننے والی مسجد خدیجہ بھی اس حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مسجد خدیجہ کی ایک خاص بات جو مغربی اقوام کے لیئے بہت حیرت کا باعث ہے کہ، اس مسجد کی تعمیر کے لیئے جرمن مسلمان خواتین کے ساتھ جرمنی میں بسنے والی مختلف رنگ و نسل کی مسلمان خواتین نے تحریک چلائی اور خواتین نے ہی اسکی تعمیر کے لیئے نہ صرف تمام مطلوبہ رقم مہیا کی بلکہ اس مسجد کا نقشہ بھی ایک مسلمان خاتون نے ہی تیار کیا۔ (مسجد خدیجہ کے بارے میں ایک الگ مضمون احباب کی خدمت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اپنی آراء سے مطلع فرمایئے۔) ہم اپنے جرمن قارئین کو اس دن کی مناسبت سے جرمنی کے انضمام کی تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

محرم تو سب کا ہوتا تھا!

تحریر حسنین جمال

ہندو تعزیہ داروں میں ایک عجیب قسم کی رسم رائج تھی۔ کچھ لوگ دسویں محرم کی رات کو "پیک" بنتے تھے۔ انہیں کچھ لوگ "ناتک" بھی کہتے تھے۔ ان کا حلیہ بہت عجیب سا ہوتا تھا۔ سر پر بہت بڑی سی پگڑی ہوتی تھی۔ بالکل ویسی کہ اگر آپ کپڑے کے تھان کو سر کے گرد لپیٹتے جائیں اور آخر میں ایک کونا طرے کی طرح باہر نکال لیں۔ کمر میں ایک چوڑا سا پٹہ بندھا ہوتا تھا جس میں درجنوں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لٹکی رہتی تھیں۔ ذرا سی حرکت پر وہ ٹن ٹن بولنے لگتیں۔ ہاتھ میں بڑا سا مورچھل ہوتا (وہ لمبا سا مور کے پروں والا پنکھا جو درباروں میں خادم بادشاہ سلامت کو جھلتے تھے)۔ تو مورچھل تھامے وہ آدمی دسویں محرم کے دن نکل پڑتا تھا۔ سارا دن حرکت میں رہتا تھا۔ ناتک بننے کی شرط یہی تھی کہ رکنا نہیں ہے۔ ہر وقت ادھر سے ادھر دوڑتا رہتا، ایک تعزیے سے ہو کر دوسرے تعزیے کی طرف جاتا، ایک جلوس سے نکلتا دوسرے جلوس میں شامل ہو جاتا۔ تیز تیز چلتا ہوا مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہتا۔ کسی مقام پر ٹھہرتا بھی تو دونوں پاؤں برابر حرکت میں رہتے۔ یہ شخص نہ کسی سے بات کرتا تھا اور نہ کسی نوحہ خوانی یا ماتم میں حصہ لیتا تھا۔ "حسین کشتہ شد" بس یہ ایک جملہ ہر گوشے، ہر مجلس، ہر جلوس، ہر محفل میں جا کر جہاں موقع ملتا، کہہ دیتا اور آگے چلا جاتا۔ اس ایک فقرے کے علاوہ ناتک کے منہ سے دوسرا لفظ کوئی نہیں سنتا تھا۔ یہ رسم بس اس چیز کی علامت تھی گویا

ایک قاصد پوری دنیا میں یہ سناؤنی دیتا پھر رہا ہے کہ حسین اب نہیں رہے۔

مرزا جعفر حسین نے قدیم لکھنو کی آخری بہار نامی کتاب میں یہ واقعہ کم و بیش اسی طرح بیان کیا ہے۔ انہوں نے قدیم رسومات محرم سے لے کر اپنے وقت تک کی ایک مکمل تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی۔ یہ واقعہ اس دور کا تھا جب برصغیر میں مختلف مذاہب اور رنگا رنگ ثقافتی عناصر اپنے پورے عروج پر تھے۔ بھائی چارہ، یگانگت، رواداری اور برداشت آج کل کے مقابلے میں کافی زیادہ تھی۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں مناظرے بھی ہوتے تھے تو جانبین اپنے سر اپنی گردنوں پر سلامت لیے اٹھتے تھے۔ کوئی اس فکر میں نہیں ہوتا تھا کہ اس کی اقدار کسی نئی رسم کے آنے سے ملاوٹ کا شکار ہو جائیں گی۔ لوگ بلاتفریق ایک دوسرے کے تیوہاروں میں شریک ہوتے تھے۔ کیا دیوالی، کیا دوسہرا، کیا عید، کیا شبرات، کیا پھول والوں کا میلہ، کیا قوالی، کیا ہولی، کیا عرس، کیا بسنت اور کیا محرم، سب تیوہار سب کے ہوا کرتے تھے۔ تعزیوں کی تو روایت ہی ہمیں ہندو مذہب سے اٹھتی نظر آتی ہے۔ یہ کلچر صرف اودھ یا دلی تک نہیں تھا۔ پشاور، ملتان اور لاہور میں بھی یہی یکجہتی پائی جاتی تھی۔ اب ایسے ماحول میں کوئی ہندو اپنے خلوص کے ہاتھوں حسین کشتہ شد کہتا گھومتا ہے تو اسے کون روکتا ہوگا۔

آگے بڑھیں تو برصغیر میں ہمیں ترقی پسند تحریک کا ایک بہت طویل باب دکھائی دیتا ہے۔ اس تحریک کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہوا کرتا تھا کہ جو اس میں شامل ہوا وہ غریب کہیں کا نہ رہا۔ لیکن یہاں بھی ہمیں حمید اختر عید کی نماز نہ پڑھنے پر بنے بھائی سے ڈانٹ کھاتے دکھائی دیتے ہیں، جوش ملیح آبادی مرثیے کہتے اور ڈٹ کر پڑھتے نظر آتے ہیں اور سید سبط حسن محرم مناتے ہوئے ملتے ہیں۔

سبطے صاحب کے بارے میں عبدالقادر حسن لکھتے ہیں، ''ہمارے استاد اور ایڈیٹر سید سبط حسن جو پکے کمیونسٹ تھے، محرم میں سیاہ رنگ کی قمیض پہن لیتے تھے، جب اس کا ذکر کیا جاتا تو وہ جواب دیتے یہ ہمارا کلچر ہے۔''

محرم کلچر میں تبدیل تب ہوا جب برصغیر والوں نے اسے مکمل طور پر اپنا لیا۔ اودھی تہذیب نے اسے اپنے اندر گوندھ لیا، اسے اتنی جگہ دے دی کہ محرم کا سوگ دس دن سے بڑھ کر پچاس دن اور پھر آٹھ ربیع الاول تک پھیل گیا۔ پچاسواں دن عاشورے کے حساب سے چہلم کا بنتا تھا۔ حکمرانوں کی نگرانی میں محرم کے جلوس نکلتے، نذر نیازیں ہوتیں، جلوس کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ڈھول تاشے والے

ہوتے، بہروپیوں نے شیر کے سوانگ بھرے ہوتے (شیر بننے کی رسم اب بھی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں موجود ہے)، باقاعدہ کربلا کی تمثیل کا تھیٹر کیا جاتا، ذوالجناح بنانے کے لیے شاہی اصطبل میں موجود اعلیٰ ترین گھوڑے وقف رہتے، جگہ جگہ خوشبودار دودھ کی سبیلیں ہوتیں، علم نکلتے اور ایسے ایسے اونچے علم ہوتے کہ دیکھنے والوں کی گردنیں رہ جاتیں۔ پھر ان علموں کے پھریرے یا جھنڈے کہہ لیجے وہ طرح طرح کے قیمتی کپڑوں کے ہوتے، جواہرات ٹنکے ہوتے، انہیں علموں کے سائے میں ماتم ہوتا، بڑا امام باڑا بنا، چھوٹا امام باڑا بنا، لکھنو میں کربلا بھی بنی، عاشورے کی رات یہ تمام امام باڑے باوجود بجلی کا دور نہ ہونے کے جگمگا رہے ہوتے۔

شاہی امام باڑوں کے دروازے بھی اس شب عوام کے لیے کھول دیئے جاتے، کبھی یہ تک نہیں پوچھا جاتا تھا کہ ہاں میاں کس مذہب سے ہو، بس صلائے عام تھی! اور یہ سب ریاست کی سطح پر کیا جاتا تھا۔ ایران جہاں سے محرم کی رسومات یہاں آئیں، وہاں بھی اس قدر رنگارنگی ہمیں نظر نہیں آتی۔ وجہ اس کی شاید یہی تھی کہ محرم ہندو، سکھ، مسلمان، جین، سبھی کا مہینہ بن چکا تھا اور تمام ثقافتیں اس میں بقدر جثہ شامل ہو چکی تھیں۔ پھر میر انیس اور میرزا دبیر نے غضب کر دیا کہ واقعہ کربلا کو بالکل دیسی لبادہ اوڑھا دیا۔ امام بات کرتے ہیں تو ہندوستانی محاوروں میں، امام کی اہل خانہ بات کرتیں تو گھر کی خواتین کی زبان میں، شادی، بیاہ، سفر، موت سب رسمیں مشرف بہ ہندوستان ہو گئیں تو ہندوستانی بے چارے کہاں جاتے۔ دیکھیے جب کوئی عقیدہ آپ کو اپنی زبان میں مل رہا ہے اور آپ ایسی عالی مقام ہستیوں کا غم ایسے محسوس کر رہے ہیں کہ جیسے سکرین پر سب واقعات چل رہے ہوں، آپ اس میں خود کو شامل محسوس کرتے ہیں، تو وہ عقیدہ محض عقیدت نہیں رہ جاتا وہ ہڈیوں میں رچ بس جاتا ہے اور اس رچاؤ کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے وہ ثقافت کہلاتی ہے۔

محرم کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا کہ علی سردار جعفری صاحب ایک دفعہ روس میں موجود تھے۔ عاشور کا دن آ گیا۔ ایک ترقی پسند دوست کے ساتھ وہ سڑک کے کنارے ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے، ان کے ہاتھ میں ایک لمبی سی پتلی چھڑی تھی جس پر انہوں نے خاصی چوڑی کالی پٹی باندھ رکھی تھی۔ گزرنے والے پوچھنے لگے کہ بھئی یہ کیا ہے۔ وہ ہر شخص کو کربلا کا سارا معرکہ بیان کرتے اور پھر کہتے کہ آج جبر کے خلاف احتجاج کا دن ہے اور ہم اس طریقے سے احتجاج کر رہے ہیں۔ تو اس ثقافت کا تعلق احتجاج سے بھی جڑا۔ آج بھی اکثر سیاسی تقریروں میں آپ حسینی قافلے اور یزیدی لشکروں کی تلمیحات سنتے ہیں، تو یہ سب ہمارے روزمرہ میں اس ثقافت کا نفوذ ہے۔

بنے بھائی (سید سجاد ظہیر) کی شریک حیات رضیہ سجاد ظہیر تھیں۔ دلی والوں نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ "دلی والے" کے نام سے چار جلدوں میں اپنے تمام بڑے لوگوں کو یاد کر لیا اور ان کے خاکے محفوظ ہو گئے۔ ڈاکٹر شمیم نکہت ان کے بارے میں اس کتاب میں لکھتی ہیں، "وہ کمیونسٹ تھیں، لیکن موقعہ پڑنے پر حضرت علی سے مدد ضرور مانگتیں۔" خدا حافظ" کبھی فراموش نہ کر سکیں۔ محرم میں چوڑیاں توڑنا اور سوگ کے کپڑے پہننا کبھی نہ بھولیں، نویں محرم کو ہمیشہ (روایت کی مناسبت سے) کپڑے پہنتیں۔ مذہب کو باقاعدگی سے نہ ماننے کے باوجود وہ اس کی بہت سی اچھی باتوں کی قائل تھیں۔ دراصل ان کا مذہب انسانیت تھا۔" کیا ان تین سطور میں بھی ہمیں میر انیس بار بار جھانکتے نظر نہیں آتے؟ اگلے وقتوں میں قرآن شریف کے ساتھ ساتھ گلستان، بوستان، کریما، اور انیس و دبیر بھی پڑھائے جاتے تھے، بلکہ پڑھائے کیا جاتے اہل تشیع کے یہاں تو بچپن سے اچھا پڑھنے کے مقابلے ہوا کرتے تھے، ایسے میں کوئی مذہب سے کتنا ہی بیگانہ کیوں نہ ہو جائے، ناسٹیلجیا مار جاتا تھا۔ جب ماضی بار بار دستک دے تو کٹھور سے کٹھور انسان بھی دروازے کھول دیتا ہے۔

"محرم کی نویں تاریخ تھی۔ میرے گھر پر رقعہ آیا" عالیہ رات کو ہمیں کام ہے، تم ضرور آنا"، میں گھر پہنچی، دیکھا تو ایک جم غفیر تھا، ٹیپ چل رہا تھا، خوب صورت گانا سنا جا رہا تھا، میں دو منٹ تو بیٹھی، اس کے بعد میں نے ایک دم دروازے کا رخ کیا۔ فیض صاحب فوراً باہر آئے، "ارے، تم دعوت چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو؟ وجہ کیا ہوئی، یہ تو بتاؤ، کیا ہم لوگوں سے خفا ہو؟" میں نے کہا نہیں، بات یہ ہے کہ ہم آج کی تاریخ میں گانا نہیں سنتے۔ میرے اس جملے کو سنتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے ان پر بجلی گر پڑی۔" ایلس، عالیہ کی خاطر کیا گانا بند کر دو گی؟" ایلس نے جذبات کا لحاظ کیا، فوراً گانا بند کیا، مجھے شرمندگی بھی ہوئی۔ بلاوجہ سب کا مزہ کرکرا کیا۔ گانا بند ہونے کے بعد کھانا ہوا۔ میں نے کہا کہ فیض صاحب آج کی رات تو ہم لوگ حضرت عباس کی درگاہ پر جاتے ہیں اس لیے زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکیں گے۔" ہاں تو ٹھیک ہے، ہم۔ بھی چلیں گے، دیکھیں گے، تم وہاں کیا کرو گی۔" کھانے کے بعد ہم لوگ درگاہ گئے، فیض صاحب نے بھی علم کو بوسہ دیا، مرثیے کے دو چار بند سنائے، پھر کہنے لگے، مرثیے تو ہمیں کہنا نہیں آتے، بس تمہاری فرمائش پر یہ لکھ دیا ہے، کیا تم کو پسند ہے؟ اب ہمارے اور تمہارے مسلک میں کیا فرق رہ گیا؟

(ڈاکٹر عالیہ امام۔ رفیق دل فگاراں)

اک یہودی کی باتیں

جن کے سر پر دوپٹہ ہونا چاہئے وہ ننگے سر کھڑی ہیں۔ میں یہودی ہوں اور اپنے یہودی ہونے پر فخر کرتا ہوں جبکہ تم اب مسلمان کہلاتے ہوئے شرماتے ہو۔ جبکہ آج دنیا میں ہماری حکومت ہے۔

تم نے دیکھا کہ ہم نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟

ہم تمہاری سڑکوں پہ پھرے تو ہمیں تمہارا حال پسند نہیں آیا۔

تو پتہ ہے ہم نے کیا کیا؟

بہت آسانی سے تمہاری لڑکیوں کے سروں سے حجاب اتروا دیا۔

دوسرے طریقوں سے قرآن بھی بھلوا دیا۔

اپنے بازاروں کو دیکھو سارے عریانی کی نمائش گاہ ہیں۔ اور تمہاری تہذیب کا لباس تمہارے بازاروں میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ تم نے سب قبول کر لیا۔

کیا تم کو نہیں معلوم کہ یہی حال قوم لوط کا تھا۔

کتنے بے وقوف ہو تم کہ کہتے رہتے ہو:

یہودیوں نے ہماری زمین چھین لی قرآن اور سنت کو ختم کروا دیا۔

تم کہاں مر گئے ہو؟ کچھ کیوں نہیں کرتے؟

سڑکوں پر تمہاری لڑکیاں ایسے لباس میں گھوم رہی ہیں کہ نام کو لباس ہے پہلے ہم نے تمہاری عورتوں کا حجاب اتارا پھر چادریں پھر دوپٹہ پھر لباس چست کیا شلواریں اونچی کیں اب شلوار کی جگہ ٹائیٹس پہنا دیا ہم نے انھیں بازاروں راستوں میں برہنہ کر دیا اب وہ ہمارا بنایا ہوا لباس فخر سے پہنتی ہیں اور تمہارا لباس پہنتے ہوئے نہیں شرم آتی ہے کیا مضحکہ خیز بات ہے۔

تمہارا حال بہت برا ہو گیا۔

ہمیں تم لوگوں کی تعلیم میں ترقی پسند نہ آئی تو ہم نے تمہارا نصاب بدلوا دیا۔ اور تمہارے ٹیلی ویژن کو ذلت آمیز پروگراموں اور شرم ناک ڈراموں میں بدل دیا۔ تمہیں اور تمھارے علماء کو کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا چپ رہنا ہی بہتر ہے۔

ہم نے تمہارے نوجوانوں کو بھٹکا دیا۔

ایک دور تھا کہ تم ایک پاکیزہ اور غالب امت تھے۔ آج تم ذلت کی پستیوں میں اتر گئے ہو بے چارے!

ہم نے محسوس کیا کہ تم لوگوں کی زبان عربی بہت خوب صورت ہے جس سے تم قرآن پڑھتے ہو اور اہل جنت کی بھی یہی زبان ہوگی تو ہم نے تمہاری زبان کو بے فائدہ اور فضول قرار دیا اور تم لوگوں نے فوراً یقین کر لیا پھر تم دوسری زبانوں پر فخر کرنے لگے۔

(ہائے بائے ہیلو مرسی برسیتج وغیرہ وغیرہ)

اور تم نے اپنے دعائیہ خوب صورت کلمات (السلام علیکم) کو چھوڑ کر انہی کا استعمال شروع کر دیا اور ہم تمہیں اسی طرح پسند کرتے ہیں

اور ہمیں یہ بھی پسند نہیں آیا کہ تم لوگوں کو متحد دیکھیں۔ تو ہم نے تمہاری مسجدوں کو اڑا دیا اور الزام بھی تم پر ہی لگایا۔ اس سے تمہارے درمیان باہمی لڑائیاں شروع ہو گئیں۔

ہم نے تمہارے دین کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور جھوٹے فتووں کے ذریعے تمہیں تمہاری راہ سے ہٹا دیا۔

ہم نے تمہارے درمیان نفرت اور فساد کی آگ بھڑکائی جو تب تک نہیں بجھے گی جب تک کہ تم سب کو جلا کر راکھ نہ کر دے۔

تمہارے گھر والے اب جدید مشینی ایجادات۔ کے زیر سایہ پرورش پاتے ہیں۔

ہم نے طرح طرح کی کمپیوٹر گیمز ایجاد کیں، جن میں کھو کر تم قرآن کو بھول گئے۔ اپنے علماء۔ کو بھول گئے۔ مسلمان سائنس دانوں اور ان کے کارناموں کو بھول گئے۔ تمہاری نئی نسل ایسی نسل ہے جو حق بات کہتے ہوئے ڈرتی ہے۔

ہم یہودی قوم۔ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ تعداد میں اس قدر تھوڑے ہونے کے باوجود ہم نے تمہیں بہت آسانی سے گوشت کے ٹکڑوں کی مانند خرید لیا۔

اور تمہیں اس کا کوئی ملال نہیں۔ تم خوش اور مست ہو۔

نوٹ: جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی بڑی تعداد کو بھیجیں۔

تلخ سہی لیکن ہے حقیقت۔

امتی! مہربانی کر کے اسے آگے بھیجو مسلمانوں کی آنکھیں کھولو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غریب پروری

تحریر ابن قدسی

کسی بھی معاشرے میں سب سے کمزور طبقہ غرباء کا ہوتا ہے حالانکہ کسی بھی معاشرے میں ان کے کردار کی اہمیت کو رد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ معاشرے میں تمام لوگ ہی امراء میں شامل ہوجائیں تو وہ یقینا ان پیشوں کو اپنانے سے اجتناب کریں گے جن کے بغیر معاشرے کی خدوخال ہی قائم نہیں رہتی۔ وہ تعمیراتی کام ہوں یا بنیادی ضروریات اور عام استعمال کی چیزوں کی فراہمی۔ ایک صفائی کے پیشہ کو ہی معاشرے سے نکال دیا جائے تو اس کے بعد پیدا ہونے والی ابتری سے معاشرے کی شکل وصورت ہی بدل جائے گی۔ اس قدر اہمیت کے باوجود ان کے حق میں اٹھنے والی آوازیں برائے نام ہوتی ہیں جو آواز اٹھاتے ہیں وہ بھی ان کا نام استعمال کرکے استعمار کا حصہ بنتے ہیں اور ان کو پھر اسی جگہ چھوڑ جاتے ہیں۔ غرباء کو معاشی طور پر مستحکم کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے غریبوں کے اندر یہ احساس پیدا کرنا ضروری ہے کہ ان کا بھی معاشرے میں ایک عزت کا مقام ہے اور ان کے اندر موجود احساس محرومی کا مداوا کیا جائے۔ پھر ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں نورِ نبوت عطا ہوا۔ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہؓ کے پاس گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی قدر متفکر تھے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان الفاظ سے تسلی دی۔

''خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں ہونے دے گا۔ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ جو خوبیاں معدوم ہوچکی ہیں ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مہمان نواز ہیں، ضروریات حقہ میں امداد کرتے ہیں۔''

(بخاری کتاب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

معاشرے میں موجود کمزور طبقہ کا خیال رکھنے کا وصف بعثت سے پہلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود تھا۔ بعثت سے قبل مکہ میں مظلوموں کی امداد کے لیے ہونے والے معاہدہ حلف الفضول میں بخوشی شمولیت بھی اسی وصف کو اجاگر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت ملنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی اکثریت اسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ انہیں جب یہ پیغام دیا گیا کہ ایک خدا ہے جس کی ہم سب مخلوق ہیں اس لیے بحیثیت انسان سب کے حقوق برابر ہیں تو اس بات نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں میں کالے، گورے، امیر، غریب سب کو شامل کر دیا۔ غرباء کو مساوی حقوق ملنے پر ان میں عزت نفس قائم ہوئی ان میں آگے بڑھنے اور معاشرے کی تعمیر وترقی میں پہلے سے بہتر کردار ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ صرف کہنے یا سننے کی باتیں نہیں تھیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں کہ جہاں ان باتوں کی عملی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

حضرت زیدؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام تھے۔ عمر چھوٹی تھی۔ ان کے والد انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور حضرت زیدؓ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بخوشی ان کے لے جانے پر رضامندی کا اظہار فرمایا۔ لیکن حضرت زیدؓ نے جانے سے انکار کردیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی میں زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ایک طرف والد جو ڈھونڈتے ہوئے وہاں آیا اور دوسرے طرف آقا۔ ایک غلام کا اپنے والد کو چھوڑ کر آقا کو منتخب کرنا بتاتا ہے کہ اس نے اس شفیق آقا میں وہ چیز دیکھی جو اسے والد کی شفقت سے زیادہ محسوس ہوئی۔ اور آزادی کے بجائے غلامی کو پسند کیا اور آقا کی شفقت کو نہیں چھوڑا۔ اس دور میں جہاں غلام کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا اس معاشرے میں غلامی کی اس قدر توقیر قائم کرنا صرف رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہی کام ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ بات یہاں پر ہی ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اسی زیدؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا لے پالک بیٹا بناتے ہیں۔ پھر اسی زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے ایک ایسے لشکر کا امیر مقرر کیا جس میں کبار صحابہؓ شامل تھے۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتداء سے لے کر وفات تک غلاموں کی عزت وتوقیر کو قائم کیا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ زاہر بن حرام نامی ایک دیہاتی اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے گاؤں کی چیزیں تحفہ کے طور پر لایا کرتا تھا اور آپؐ بھی اس کی واپسی پر شہر کی کوئی نہ کوئی سوغات ضرور عنایت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا ''زاہر ہمارے لئے دیہات ہے اور ہم اس کے لئے شہر ہیں'' حضورؐ کو زاہر سے بے حد انس تھا۔ زاہر کی شکل وصورت اچھی نہ تھی۔ ایک دن وہ اپنا سودا بیچ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیچھے سے آئے اور بے خبری میں اس کی

آنکھیں موند لیں۔اس نے کہا کون ہے مجھے چھوڑ دے۔مگر جب مڑ کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے جس پر وہ اپنی کمر حضور ﷺ کے سینہ مبارک پر ملنے لگا۔آپؐ نے فرمایا یہ غلام کون خریدتا ہے۔زاہر کہنے لگا یا رسول اللہ! تب تو آپ مجھے ناقص مال پائیں گے۔آپؐ نے فرمایا مگر اللہ کے نزدیک تو تو ناقص مال نہیں ہے۔'' (شمائل الترمذی باب فی مزاح رسول اللہ ﷺ)

آپ ﷺ نے معاشرے میں اپنے آپ کو سب سے کمزور سمجھنے والے کی کس طرح عزت نفس قائم فرمائی۔آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''ہر کمزور اور ضعیف آدمی جنتی ہے'' (بخاری) آپؐ غرباء کو کھانے وغیرہ کی دعوتوں میں بلانے کی تحریک کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''وہ دعوت بہت بری ہے جس میں صرف امراء کو بلایا جائے اور غرباء کو شامل نہ کیا جائے۔'' (بخاری) حضرت معاویہؓ بن حکم نے بکریاں چرانے والی لونڈی کو اس بات پر تھپڑ مار دیا کہ ایک بکری بھیڑیا لے گیا۔رسول کریم ﷺ کے سامنے ذکر ہوا تو آپؐ پر یہ بات بہت گراں گزری۔معاویہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اسے آزاد نہ کردوں؟ آپؐ نے اسے آزاد کرنے کا ارشاد فرمایا۔(مسلم) غرض کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کے سامنے کسی مظلوم، غریب، بے کس کا ذکر ہوا تو آپ جس حد تک بھی ممکن ہو اس کی مدد نہ فرمائی ہو۔بے کس خواہ کسی ملک اور قوم کا ہو اس کی مظلومیت کا حال سن کر آپؐ بے چین ہو جاتے تھے۔

مہاجرین حبشہ جب مدینہ واپس لوٹے تو نبی کریمؐ نے اس نے دریافت فرمایا کہ ملک حبشہ میں تم نے کیا کچھ دیکھا۔وہاں کی کوئی دلچسپ بات تو سناؤ ایک نوجوان نے یہ قصہ سنایا کہ ایک دفعہ ہم حبشہ میں بیٹھے تھے۔ایک بڑھیا کا ہمارے پاس سے گزر ہوا۔اس کے سر پر پانی کا ایک گھڑا تھا وہ ایک بچے کے پاس سے گزری تو اس نے اسے دھکا دیا اور وہ گھٹنوں کے بل آ گری۔گھڑا ٹوٹ گیا۔بڑھیا اٹھی اور اس بچے کو کہنے لگی اے دھوکے باز بدبخت! تجھے جلد اپنے کئے کا انجام معلوم ہو جائے گا جب اللہ تعالیٰ اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوگا اور فیصلہ کے دن پہلوں اور پچھلوں سب کو جمع کرے گا۔ہاتھ اور پاؤں جو کچھ کرتے تھے خود گواہی دیں گے۔تب تمہیں میرے اور اپنے معاملے کا صحیح علم ہوگا۔رسول اللہؐ نے جوش ہمدردی سے فرمایا اس بڑھیا نے سچ کہا اللہ تعالیٰ اس قوم کو کیسے برکت بخشے اور پاک کرے گا جس کے کمزوروں کو طاقتوروں سے ان کے حق دلائے نہیں جاتے۔(السیرۃ الحلبیہ)

ضرورت مند کو سوال سے بچانے کے لیے رسول کریمؐ فرمایا کرتے کہ میرے تک مستحقین کی سفارش پہنچا دیا کرو تمہیں اس کا اجر ملے گا۔باقی اللہ جو چاہے گا اپنے رسول کی زبان پر اس ضرورت مند کے بارہ میں فیصلہ فرمائے گا۔(بخاری)

آپؐ کو غریبوں کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک غریب مسجد میں آیا۔رسول اللہؐ نے صدقہ کی تحریک فرمائی کہ لوگ کچھ کپڑے صدقہ کریں۔لوگوں نے کپڑے پیش کر دیئے۔حضورؐ نے دو چادریں اس غریب کو دے دیں۔اس کے بعد آپؐ نے پھر صدقہ کی تحریک فرمائی تو وہی غریب اٹھا اور دو میں سے ایک چادر صدقہ میں پیش کر دی۔رسول اللہ نے اسے باآواز بلند فرمایا کہ اپنا کپڑا واپس لے لو۔(ابوداؤد)

انسان کاروبار کرتا ہے۔محنت سے روزی روٹی کا بندوبست کرتا ہے لیکن بعض اوقات کاروبار میں نقصان ہو جاتا ہے اور نقصان اس قدر ہوتا ہے انسان مقروض ہو جاتا ہے۔ایسے وقت میں اگر اسے سنبھال لیا جائے تو معاشرے کا ایک مفید وجود ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔رسول اللہؐ کے زمانے میں ایک شخص نے پھلوں کے کاروبار میں بہت نقصان اٹھایا۔قرض بہت زیادہ ہو گیا۔نبی کریمؐ نے اس کے لیے صدقہ کی تحریک فرمائی لوگوں نے صدقہ دیا مگر جتنا قرض تھا اتنی رقم اکٹھی نہ ہو سکی۔رسول اللہؐ نے قرض خواہوں کو فرمایا کہ جو ملتا ہے لے لو۔باقی چھوڑ دو اور معاف کر دو۔(احمد)

کبھی غربت کسی کو معاشرے کا حصہ بننے میں رکاوٹ ڈال دیتی ہے۔اس طرح کا معاملہ بعض اوقات رشتہ کرتے ہوئے سامنے آ جاتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے ایک غریب صحابی جلبیب کے رشتہ کا پیغام ایک انصاری لڑکی کے والد کو بھجوایا۔وہ کہنے لگے میں اس کی ماں سے مشورہ کرونگا۔اس آدمی نے جب بیوی سے مشورہ کیا تو وہ کہنے لگی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم جلبیب جیسے غریب آدمی کو رشتہ دے دیں حالانکہ اس سے پہلے ہم اس سے بہتر رشتہ رد کر چکے ہیں۔لڑکی پردے میں سن رہی تھی کہنے لگی کیا تم رسول اللہ ﷺ کے حکم کو موڑو گے، اگر حضور راضی ہیں تو نکاح کر دو۔چنانچہ اس کے والد نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ بچی راضی ہے اس لئے ہم بھی راضی ہیں۔یوں آپ ﷺ نے جلبیب کی شادی کروادی۔(احمد) کئی اور مواقع پر آپ ﷺ نے غرباء کا رشتہ کروایا۔اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کا رشتہ اپنے رشتہ داروں میں کروایا۔آپ ﷺ نے یہ بھی تلقین کی کہ رشتہ کرتے وقت دین داری کو ترجیح دو۔

ایک تو آپ ﷺ نے اپنے اسوہ سے غرباء اور کمزوروں کی عزت قائم کی اور ان کا خیال رکھنے کی تلقین فرمائی۔آپ ﷺ کے اسوہ پر عمل کرنے سے خدا خوش ہوتا ہے اور یہ اسوہ قیامت تک قابل عمل ہے۔اس کے علاوہ قیامت تک قائم رہنے والی شریعت قرآن میں ایسی تعلیم چھوڑی ہے جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں یہ طبقہ بنیادی سہولیات کو بڑی آسانی سے حاصل کر لیتا ہے۔قرآن کریم نے زکوۃ ادا کرنے کا حکم دیا اور یہ حکم صرف ایک دفعہ نہیں دیا بلکہ اسے بار بار دہرایا ہے۔زکوۃ کیا ہے؟ زکوۃ مال داروں سے لی جاتی ہے اور اسے غرباء پر خرچ کیا جاتا ہے۔اس طرح دولت چند افراد تک محدود نہیں ہوتی بلکہ جتنا کوئی زیادہ مال جمع رکھتا ہے اسے اتنی ہی زیادہ زکوۃ دینی پڑتی ہے۔دولت کی اس تقسیم سے سب

سے زیادہ فائدہ غرباء کو ہوتا ہے۔ اگر صاحب نصاب لوگ باقاعدگی اور دیانت داری سے زکوۃ دیتے رہیں تو غرباء کو معاشی طور پر مستحکم کرنے کے لیے منصوبہ بندی کا دائرہ بھی بہت وسیع بن سکتا ہے۔

زکوۃ کے علاوہ قرآن کریم نے مساکین، مسافروں، غریب رشتہ داروں، یتیموں اور غلاموں کا خیال رکھنے کا بھی حکم دیا۔ یہ تمام طبقات بھی معاشرے میں غریب اور کمزور سمجھے جاتے ہیں۔ عرب کے اس وقت کے ماحول کو مدنظر رکھا جائے تو عورت کو بھی ان طبقات میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام کے لیے قرآن کریم نے بڑے تفصیلی احکامات دیے ہیں۔ اور نہ صرف ان کا خیال رکھنے کا حکم دیا بلکہ ان کے حقوق بھی متعین کیے ہیں۔ فرمایا ''اور ان کے اموال میں سوال کرنے والوں اور بے سوال ضرورت مندوں کے لیے ایک حق تھا'' (الذریات:20) اموال میں ضرورت مندوں کا حق تسلیم کرنا ہی اس تعلیم کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ ''اور جب (ترکہ کی) تقسیم پر (ایسے) اقرباء (جن کو قواعد کے مطابق حصہ نہیں پہنچتا) اور یتیم اور مسکین بھی آجائیں تو کچھ اس میں سے ان کو بھی دو اور ان سے اچھی بات کہا کرو۔'' (النساء:9) غریب مسکین طبقہ کو وراثت میں سے کچھ دلانے کی تعلیم صرف رسول کریم ﷺ نے ہی دی ہے۔ جہاں تک عورت کے حقوق کی بات ہے تو جس قدر اسلام نے عورت کو حقوق دیئے ہیں پہلی کسی شریعت نے دیئے۔ اس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ غلاموں کے بارے میں تعلیم بھی بہت وسیع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف اس وقت موجود غلاموں سے حسن سلوک اور ان کو آزاد کرنے کی تعلیم دی بلکہ غلام بنانے کی ایسی سخت شرائط عائد کردیں کہ آئندہ غلام بنانے کا دروازہ تقریباً بند ہوگیا اور معاشرے میں موجود غلاموں کو آزاد کرنے کے کئی راستے بیان فرمائے جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ غلام آزاد ہوتے گئے۔

غریب کا خیال نہ رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس طبقہ کے ساتھ وابستہ مفادات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ ایک امیر کیوں اپنا مال غریب کو دے۔ قرآن کریم نے غرباء کا خیال رکھنا نیکی بلکہ بڑی نیکی شمار کیا ہے۔ ان سے حسن سلوک کے نتیجہ میں خدا خوش ہوتا ہے۔ خدا کے رضا کی خاطر ہونے والے کام میں دنیاوی اغراض معدوم ہوجاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان دلی خوشی اور بشاشت سے وہ کام کرتا ہے اور اسے اموال کے خرچ کے بعد کسی قسم کا لالچ نہیں ہوتا سوائے خدا کی رضا کے۔

قرآن کریم میں ہے کہ عقبہ (یعنی چوٹی) کیا ہے اور یہاں مراد روحانیت کی دنیا میں نیکی کی چوٹی ہے۔ فرمایا ''گردن کا آزاد کرنا، یا ایک عام فاقے والے دن میں کھانا کھلانا، ایسے یتیم کو جو قرابت والا ہو یا ایسے مسکین کو جو خاک آلودہ ہو۔'' (البلد:13 تا 17) پھر فرمایا کہ ''اور وہ کھانے کو اس کی چاہت کے ہوتے ہوئے مسکینوں اور یتیموں اور اسیروں کو کھلاتے ہیں ہم تمہیں محض اللہ کی رضا کی خاطر کھلا رہے ہیں ہم ہرگز نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ کوئی شکریہ (الدھر:9، 10) پھر نیکی کے حوالے بیان فرمایا کہ نیکی یہ ہے کہ اپنے اموال دے ''اقرباء کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو'' (البقرۃ:178) فرمایا ''کیا تم نے اس شخص پر غور کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ پس وہی شخص ہے جو یتیم کو دھتکارتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا'' (الماعون:2 تا 4)

رسول کریم ﷺ نے خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے یہ اعلیٰ تعلیم لوگوں کے سامنے رکھی۔ اور قیامت تک کے غرباء کی کفالت کا انتظام فرمادیا۔ اگر اس تعلیم پر عمل کرلیا جائے تو دنیا میں کوئی بھی شخص کم از کم غربت کی وجہ سے ہلاک نہیں ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کی غریب پروری بڑا ہی حسین امتزاج اپنے اندر رکھتی ہے۔ ایک طرف آپ ﷺ نے غرباء کی عزت وتوقیر قائم کرتے ہوئے ان کا خیال رکھنے اور ان پر مال خرچ کرنے کی تلقین فرمائی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکل سکتا تھا کہ معاشرہ میں غرباء کی تعداد زیادہ ہوجاتی۔ اس لیے آپ ﷺ نے غریبوں کی عزت وتوقیر قائم کرنے کے بعد آپؐ نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور خود اپنی روزی کمانے کی مسلسل تلقین فرمائی تاکہ کوئی بھی طبقہ معاشرے پر بوجھ نہ بنے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ فرائض کی طرح محنت کی کمائی بھی فرض ہے'' (مشکوۃ باب کسب وطلب الحلال) پھر فرمایا کہ ''پاکیزہ خوراک وہ ہے جو تم خود کما کر کھاؤ اور تمہاری اولاد بھی تمہاری عمدہ کمائی میں شامل ہے۔'' (ترمذی) پھر فرمایا کہ ''تم میں سے جو شخص رسی لے کر جنگل میں جاتا ہے اور وہاں سے لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھا کر بازار میں آتا ہے اور اسے بیچتا ہے اور اس طرح اپنا گزارہ چلاتا ہے اور اپنی آبرو اور خودداری پر حرف نہیں آنے دیتا وہ بہت ہی معزز ہے اور اس کا یہ طرز عمل لوگوں سے بھیک مانگنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔'' (بخاری) پھر فرمایا کہ ''لوگوں کو سوال کرنے سے بچنا چاہیے۔ اوپر والا ہاتھ جو خرچ کرنے والا ہے نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' (مسلم)

رسول کریم ﷺ کی غریب پروری ایسی اعلیٰ درجہ کی ہے کہ اس کا کسی سے موازنہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آپؐ نے معاشرے میں موجود غرباء کی عزت کو قائم کیا ان کو ایک مفید وجود بنانے کے لیے اپنا اسوہ اور اپنی تعلیمات چھوڑی۔ آپ ﷺ نے یہ واضح فرمایا کہ کوئی بھی غریب لوگوں کو کمزور سمجھ کر ان کا حق نہ مارے اور نہ ان پر زیادتی کرے۔ یہ خدا تعالیٰ کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے اعلیٰ درجہ کا نبی عطا فرما کر دنیا کی راہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں رسول کریم ﷺ کی دی ہوئی تعلیم اور آپ ﷺ کے اسوہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جس دن ماں کی سمجھ آجائے علم آجائے گا

(لاہور انٹرنیشنل ڈیسک)

جب میں گاؤں سے پہلی بار شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلنے لگا تو میری ماں نے میرا ماتھا چوما نم آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں سے مگر مسکراتے ہوئے بولی؛

پُتر گاؤں کے اکثر پنچھی شہر میں جا کر راستہ بھول جاتے ہیں، شہر مصنوعی زندگی کا میلہ ہوتے ہیں، "سفید چھڑی" یاقوت اور ہیرے سے بھی بنی ہو آنکھوں کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔

پنچھی تو فطرت کے سفید ہوتے ہیں۔ سُنا ہے شہروں میں پرندے بکتے ہیں فطرت کو بیچا نہیں کرتے یہ سبق میں نے فنا کی کتاب سے پڑھا تھا جس کا دیباچہ دیمک نے لکھا تھا۔

پُتر درسگاہیں روحانی کعبہ ہوتی ہیں۔ اس کا دل سے احترام کرنا، اس میں جوتوں سمیت داخل مت ہونا، اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ ایثار اور قربانی کا تعلق رکھنا۔ پُتر سوہنے رب کو قربانی بہت پسند ہے۔ معزز ہونے کے لئے قربانی سے مختصر راستہ کوئی نہیں۔

پروردگارِ عالم کو حضرتِ ابراہیمؑ کی قربانی اتنی پسند آئی کہ اس نے اس کائنات میں بطور انعام تقسیم کو ضرب میں بدل دیا ہے۔ جتنا اللہ کی راہ میں قربان کرو گے، جتنا تقسیم کرو گے اس سے کئی گنا وصول کرلو گے۔

پُتر میں آج خوش بھی ہوں اور اُداس بھی۔ خوش اس لئے کہ تو علم کے جہاد پر جا رہا ہے۔ فرمانِ مبارک ہے جو طالب علم، طالبِ علمی میں مارا گیا وہ شہید ہے۔

اُداس اِس لئے کہ تو میری نظروں سے دور جا رہا ہے۔

ہجر اور انتظار کا دکھ دیکھنا ہو تو سوکھی ٹہنیوں کی طرف دیکھ لینا۔ رب نے ماں بھی کیا عجیب ہستی پیدا کی ہے، لمحہ لمحہ جیتی ہے، لمحہ لمحہ مرتی ہے۔ پُتر اُداسی کی آنکھوں میں ہمیشہ گہری شام کے کاجل کی برسات رہتی ہے۔

علم کا غرور نہ کرنا۔ غرور اور شعور ایک دماغ میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ علم کی بارش ہمیشہ عاجزی کی کُٹیا ہی میں برستی ہے۔ رب سے ہر لمحہ مانگتے رہا کرو، دعائیں دستک کی طرح ہوتی ہیں جو لوگ دستک کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے ان کے دامن خالی رہتے ہیں۔

اپنے رب سے چیزوں کی ہیئت کا نہیں فطرت کا علم مانگنا۔ جب میں نے دروازے سے پاؤں باہر نکالا تو ماں بولی پُتر جب تک دل چاہے شہر میں رہنا مگر جب شہر کے گنبد بے کبوتر ہو جائیں تو گاؤں لوٹ آنا، گنبد پرندوں سے ویران ہو جائیں تو آسمانوں سے بلائیں اُترنا شروع ہو جاتی ہیں اور پھر انسانوں کا یہ جنگل کتبوں جیسے چہرے لئے اپنی اپنی قبروں کی تلاش میں چل پڑتا ہے۔

اُس کا چہرہ جیسے کسی کھوئی ہوئی شب کا اُداس چاند جس کی جاگتی ہوئی آنکھوں میں نیند سوئی رہتی ہے۔ موٹی موٹی لازوال آنکھیں جس کی پلکوں کے جھولنے سے صبح شام کا سفر جاری رہتا ہے۔

گونگے بہرے بچوں والی آنکھیں جہاں ہونٹ نہیں آنکھیں بولتی ہیں۔

وہی لاجواب کر دینے والی سوال آنکھیں

کبھی کبھی میرا دل چاہتا میں اسے کہوں اپنے چہرے سے آنکھیں تو ہٹاؤ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔

مگر ایک انجانا سا خوف کہ

"محبت کی برسات میں اچانک شام ہو جایا کرتی ہے"۔

ہم یونیورسٹی میں ایک ہی کلاس میں تھے

ایک دن کہنے لگی

تنویر مشتاق

تم دوسروں سے مختلف کیوں ہو، تمہارے خواب تعبیر کی بھیڑ میں گم کیوں نہیں ہوتے، یہ محبت ہے یا تم نے کوئی فن سیکھا ہے۔

ایمان!

مجھے ایک ادنیٰ سا فن نہیں آتا جو شہروں میں سب کو آتا ہے۔ میری ماں نے مجھے وہ فن سیکھنے سے سختی سے منع کر دیا تھا کیا؟

قصیدہ گوِ سُلطان

ماں کہتی ہے اگر تم نے یہ فن سیکھ لیا تو تمہیں کوئی اور فن نہیں آئے گا۔ کہتی ہے یہ فن غلام سیکھتے ہیں۔ غلام آقاؤں کے ہوں یا اپنی خواہشِ نفس کے، غلام اور غلامی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، غلام قومیں اپنی روٹی کے لئے کشکول کی طرف دیکھتی ہیں اور آزادانہ قوموں کا رزق نیزے کی نوک پر ہوتا ہے۔ جس کو اپنے پروں پر بھروسا ہو وہ پرندہ آشیانہ نہیں بناتا۔

مجھے اپنے ماں باپ کے متعلق کچھ بتاؤ۔

میں نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا اور اپنی ماں کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا۔ میری ماں کہتی ہے جب تو دو سال کا تھا رب نے اُسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ وہ اپنی آخری عمر میں ملکی حالات پر بہت پریشان رہتا تھا جیسے ہر تعلیم یافتہ، شریف النفس اور سمجھدار انسان ایک غیر جمہوری ملک میں اذیت میں رہتا ہے اور میری ماں گاؤں میں رہتی ہے۔

میں اُس کی دعاؤں کے حصار میں رہتا ہوں۔ وہ میری جدائی میں اتنی کمزور اور دبلی ہو چکی ہے جیسے پاکستان میں جمہوریت۔

وہ مسکرانے لگی۔

مجھ سے غیر سیاسی باتیں کیا کرو۔

سیاست بُری چیز نہیں یہ خدمت کا دوسرا نام ہے۔ رہنما اگر راہزن بن جائیں تو سیاست ایوانِ اقتدار کی لونڈی بن جاتی ہے۔

تو میں بتا رہا تھا۔

میری ماں پڑھی لکھی نہیں مگر اُس کی باتیں سن کر پڑھے لکھے بھی حیران ہو جاتے ہیں۔ اُس کے ہونٹ قدیم صداقتوں کے امین ہیں۔ بچپن میں ماں اور میں دونوں سارا دن ڈھیروں باتیں کرتے رہتے تھے۔ مجھے بہت کم باتوں کی سمجھ آتی تھی مگر میرا دل چاہتا تھا میری ماں مجھ سے یونہی باتیں کرتی رہے اور میری عمر بیت جائے۔

میری ماں محبت اور قربانی کا مرکب ہے۔ ایک رات کھلے آسمان کے نیچے لیٹے اَن گنت بے شمار تاروں کو دیکھ کر میں نے ماں سے پوچھا۔ ماں یہ چاند، تارے، سورج اور دوسرے سیارے آپس میں ٹکراتے کیوں نہیں۔ ماں مسکرائی اور بولی پُتر:

"مرکز ایک ہو تو کوئی بھی کسی سے نہیں ٹکراتا"۔

میں نے کہا ماں تجھے یہ ساری باتیں کون بتاتا ہے۔ تُو تو ایک دن بھی سکول نہیں گئی۔ ماں مسکرائی اور بولی۔

من کا شیشہ صاف ہو تو ساری کائنات نظر آتی ہے۔ مجبور اور لاجواب ہونا ناپاک لوگوں کا مسئلہ ہے۔ پاکیزگی زمان و مکان سے انسان کو آزاد کر دیتی ہے۔ میں پڑھی لکھی نہیں بھی تو کیا ہوا۔ مجھ پہ سوہنے کملی والے کا کرم ہے جو سبز گنبد میں رہتا ہے۔ پُتر مدینے والا پیغمبروں کی سلطنت کا شہنشاہ ہے۔ جب تیرا باپ اللہ اُس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے لندن گیا تو وہاں اُس نے سب لائبریریاں دیکھیں، مجھے کہنے لگا نیک بخت میں نے لاکھوں کتابوں کو "ماں" کے ایک لفظ کے آگے ہاتھ باندھے شرمندہ کھڑے دیکھا ہے۔

کہنے لگی پُتر اب ایک ہی خواہش ہے تیرے سہرے کے بعد رب کا گھر دیکھوں اور سوہنے کا سبز گنبد دیکھوں۔ کئی رنگ بولتے ہیں اِن میں صدا ہوتی ہے۔ نیلا رنگ کہتا ہے سبز رنگ کے غلام بن جاؤ اور سبز رنگ کہتا ہے جو مجھ سے محبت کرے گا رحمت اور فلاح کا حقدار بن جائے گا۔

باپ کا سایہ نہ ہونے کی وجہ سے جب میں دل کے میلے میں موت کا کنواں لگا کر خوفزدہ اور سہما بیٹھا ہوتا تو ماں مجھے دیکھ کر تڑپ جاتی، مجھے گلے لگاتی، پیار کرتی، دعائیں دیتی اور پھر مجھ سے اتنی باتیں کرتی کہ میں اُس کی باتوں کی برسات میں بھیگ جاتا اور پھر ساتھ وہ اللہ کا ذکر بھی کرتی جاتی اور میں بڑا ہونے لگ جاتا اور پھر کچھ دیر کے بعد مجھے لگتا میرا قد بادلوں کو چھونے لگ گیا ہے۔

میرے اندر اتنی طاقت اور علم آ گیا ہے کہ میں تنہا ملکہ سبا کا تخت اُٹھا کر لا سکتا ہوں۔ ایک دن میں نے ماں سے پوچھا، ماں جب میں اندر سے کمزور ہو جاتا ہوں تم مجھے لمحوں میں کیسے اتنا بڑا اور طاقتور کر دیتی ہو، کیا تمہیں جادو آتا ہے۔

ماں مسکرائی اور بولی پُتر یہ جادو نہیں۔

دُعا، توجہ، اُمید اور اللہ کا ذکر انسانوں کو بڑا کر دیتا ہے۔ کہتی ہے شکوے کی جگہ شُکر کو لے آؤ اور انا اور تکبر سے بڑا شرک کوئی نہیں۔

وقت کا پنچھی اڑتا رہا میرے دل کے کعبے میں ایمان اور میری ماں کی یادوں کے بت پڑے ہوئے تھے۔ ماں کہتی ہے جس دن تمہیں یہ معلوم ہو گیا کہ عبادت اور پوجا میں کیا فرق ہے اس دن تم علم والے بن جاؤ گے۔

میری تعلیم مکمل ہو گئی تھی۔ اب میں واپس اپنے گاؤں جانا چاہتا تھا۔ میں دو کشتیوں کا مسافر تھا۔

ایک طرف میرا عشق تھا اور دوسری طرف میری ماں اور میرا گاؤں تھا۔ ماں کہتی ہے شہر طلسمی اثر میں رہتے ہیں۔ شہروں میں آدمی رفتہ رفتہ بے حس ہونے لگتا ہے بالکل اُسی طرح جس طرح بچہ کہانی سنتے سنتے سونے لگتا ہے۔

ایمان کا اصرار تھا کہ ہم شہر ہی میں رہیں گے۔ ماں جی کو بھی شہر میں بلا لیں گے مگر

میں گاؤں کا سرسبز جنگل چھوڑ کر شہر کی آلائشوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میرا اور ایمان کا تعلق بھی عجیب تھا۔ نہ اس نے مجھے قید کیا نہ میں نے رہائی لی۔

پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔

اگرچہ ایمان کی آنکھیں جاگی ہوئی رات کا فسانہ سنا رہی تھیں مگر میں نے بولنا شروع کیا۔

دیکھو ایمان!

چاند کو دن کا سفر اچھا نہیں لگتا، مجھے ترقی کا وہ آب حیات نہیں چاہئے جو میری ماں کے دکھ کے پیالے میں دِیا جائے۔ کل میں نے شہر کے سب گنبدوں کو بے کبوتر دیکھا ہے۔ میری ماں نے مجھے کہا تھا جب تک دل چاہے شہر میں رہنا مگر جب گنبد بے کبوتر اور پرندوں سے ویران ہو جائیں واپس لوٹ آنا۔

ویران گنبد آسمانوں کو اچھے نہیں لگتے۔ ہر دور کا اپنا ایک سچ ہوتا ہے اور میرے دور کا سچ جھوٹ ہے۔ فطرت سے دوری کا نام ہے۔ مجھے کاغذ کے پھول اچھے نہیں لگتے۔

بچپن میں اکثر سنتا تھا کسی مزدور کا ہاتھ مشین میں آ کر کٹ گیا۔ پھر مجھے مشینوں سے نفرت ہو گئی۔ شہروں میں یا تو مشینیں ہوتی ہیں یا روبوٹ نما انسان۔

ماں کہتی ہے تو تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے باپ کی زمینیں کاشت کرنا۔ مفلسی سے نہیں گھبرانا۔ خزانوں پر تو صرف سانپ بیٹھا کرتے ہیں۔ ماں کہتی ہے جہاں امیر محلات میں اور انسان فٹ پاتھ پر سوئے وہاں رحمت کب آ سکتی ہے۔

جب سے انسان نے رب کو چھوڑ کر اپنی عقل پر بھروسا کیا ہے اور دولت کو اپنی دانش مندی اور کوشش کا حاصل قرار دیا ہے اللہ نے اُن پر شہروں کے عذاب مسلط کر دیئے ہیں۔

شہروں میں لوگ نہیں لباس رہتے ہیں۔ لباس بدلتے رہتے ہیں۔

اس لئے یہاں کسی کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ فطرت کو خاموشی پسند ہے مگر یہاں انسانی ضمیروں کا شور حد سے بڑھ گیا ہے۔ اس لئے فطرت پسند یہاں سے ہجرت کرنے لگ گئے ہیں۔

یہاں سفر کی حکومت ہے مگر یہاں ہر راستہ جمود کی منزل کی طرف جاتا ہے۔ یہاں کے آئینے بھی آسیب زدہ ہیں۔ یہاں کسی کو بھی اپنی صورت کا عیب نظر نہیں آتا۔

اور پھر میں گاؤں چلا آیا۔ میری ماں کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ کہنے لگی پُتر تم نے صحیح فیصلہ کیا۔ شہروں میں ہر شخص گفتگو کی حسرت لئے عمر بھر اپنی ہی ذات کے حجرے میں معتکف رہتا ہے۔

میری دعاؤں سے تجھے وہ بھی ملے گا جو تو چاہتا ہے۔ میں ماں کو کیا بتاتا ہجر کا ایک ایک سانس سینے میں کنکر کی طرح لگتا ہے۔ سمندر کے ہجر میں صحرا پہ کیا گزرتی ہے۔

مجھے وہ بڑھیا یاد آ گئی جو اپنے بھوکے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لئے برسات کی شب اپنی ٹپکتی ہوئی جھونپڑی کی چھت کو دیکھ کر اپنے بیمار خاوند سے پوچھ رہی تھی یہ قیامت جیسی لمبی رات کب گزرے گی۔

ماں کی دعائیں رنگ لائیں اور ایمان اپنے ماں باپ کے ساتھ گاؤں پہنچ گئی اور پھر میری زندگی کے سفر میں شامل ہو گئی۔

دعاؤں میں کتنا اثر ہوتا ہے۔ یہ بات مجھے اب معلوم ہوئی۔ ایمان نے یہاں گاؤں میں اپنا سکول کھول لیا اور میں نے ایک بہت بڑا Goat Farm بنا لیا تھا۔

میری ماں بہت خوش تھی۔ اس کا ہر دن عید کا دن تھا اور ہر رات شب برات۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ ایمان سے پیار کرتی۔ ایمان اور میرے بچوں کا ایک پل بھی ماں جی کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔

اور پھر ایک دن اچانک ماں جی ہمیں سوگوار چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ پچھلی شب وہ مجھ سے کہہ رہی تھی پُتر زندگی اور موت ایک اونٹ پر رکھی دو پالکیاں ہیں۔ وہ ایک پالکی سے دوسری پالکی میں چلی گئی تھی۔

وہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں جن کی پلکوں کا آنچل ہمیشہ فرض اور قربانی کی ہوا میں لہراتا رہتا تھا۔ مجھے اُس دن پتہ چلا جب چمن سے خوشبو رخصت ہو جائے تو اُسے خزاں کہتے ہیں مگر جب دنیا سے ماں رخصت ہو جائے تو اُسے قیامت کہتے ہیں۔

مجھے اُس دن معلوم ہوا ماں حیات ہو تو انسان ساکت رہتا ہے مگر سفر جاری رہتا ہے۔ ماں کے بعد انسان بھاگتا رہتا ہے مگر سفر رُکا رہتا ہے۔ مجھے اُس دن پتہ چلا ہر مرنے والا فانی نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ فنا ہونے کی بجائے فتح یاب ہو کر دوسروں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ میرے بچوں کی ماں اور دادی اب صرف ایمان ہی تھی۔

یہ واحد موت تھی جس میں سارا گاؤں اشک بار تھا۔ میں نے پہلی بار کسی کی موت پر گورکن کو روتے دیکھا تھا۔

ماں کو ہم سے جدا ہوئے دس سال ہو چکے ہیں۔ ماں کے بعد بھی میں عید مناتا ہوں مگر گونگے بہرے بچوں کی طرح، میں ماں جی کی تصویر پر لب رکھ کر سارا دن روتا رہتا ہوں مگر زبان سے الفاظ نہیں نکلتے۔ ایمان اور اپنے بچوں کی سوجھی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اندر سے کٹ جاتا ہوں مگر ساعتیں نوحہ گر رہتی ہیں۔

آج عیدالاضحیٰ کی شام ہے اور میں ماضی کی کتاب سے بہت سال پہلے کے

صفحات کو پڑھ رہا ہوں۔

جب میں تعلیم مکمل کر کے گاؤں واپس آیا تھا۔ اُس عید کو میں نے ماں جی کے سامنے خواہش رکھی تھی کہ میں ایک بہت بڑا Goat Farm بنانا چاہتا ہوں۔

ماں جی بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگی۔

پُتر یہ تو بہت برکت والا کام ہے۔

قدرت کو افزائش نسل سے بہت دلچسپی ہے اور پھر مجھے گھر کی ساری بھیڑ بکریاں جو ایک درجن کے قریب تھیں ذبح کرنے کا حکم دیا۔ میں بہت حیران ہوا میں نے کہا ماں جی ایک دو کی قربانی کر لیتے ہیں ایک درجن ہی کیوں؟ ماں جی بولی تم فلسفہ قربانی سے واقف نہیں ہو اس لئے کہ تمہیں چیزوں کی فطرت کا علم نہیں۔ میں نے حضرت اسماعیلؑ کی طرح سر جھکا دیا۔

ماں جی بولیں سُنو!

فلسفہ جہاد کیا ہے۔ جو چیز اللہ کی راہ میں قربان کی جاتی ہے، جو چیز اللہ کی راہ میں ذبح کی جاتی ہے وہ بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد جو بڑھ رہی ہے اُس کے پیچھے فلسفہ جہاد ہے۔

ورنہ جب سے دنیا میں مسلمان آیا ہے وہ کینیا ہو، فلپائن ہو، ہندوستان ہو، افغانستان ہو، بوسنیا ہو، فلسطین ہو یا عراق، شام ہو یا کشمیر یا کوئی اور ملک مسلمان ہر جگہ کٹتا نظر آ رہا ہے۔ مگر اس کی آبادی آج بھی دنیا میں بڑھنے کو ہے۔ اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ اللہ کے لئے جاں دیتا ہے۔

جنگِ بدر کے 313 آج اربوں ہو چکے ہیں۔ فطرت کا اصول ہے جو چیز اللہ کی راہ میں قربان کی جاتی ہے یا ذبح کی جاتی ہے وہ بڑھ جاتی ہے۔

کیا کبھی کسی نے کتوں کے ریوڑ دیکھے ہیں۔ کتا کبھی ذبح نہیں ہوتا حالانکہ اُس کے تو دس دس بچے ہوتے ہیں۔ بکریوں کو دیکھ لیں، بکریوں کے ریوڑ ہوتے ہیں جن کو روزانہ ذبح کر کے کھاتے ہیں، لاکھوں بکریاں، گائیں، بھینسیں، بھیڑیں عیدِ قربان پر ذبح کی جاتی ہیں۔ وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

میں سوچ رہا ہوں!

ماں تو صحیح کہتی تھی جس کو اشیاء کی فطرت کا علم آ جائے اُس کو قربانی کا فلسفہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

(کتاب گونگے کا خواب سے اقتباس)

یہ 1973ء کی بات ہے۔ عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑنے کو تھی کہ امریکی سینیٹر اہم کام کے سلسلے میں اسرائیل آیا۔ وہ اسلحہ کمیٹی کا سربراہ تھا۔ اسے فوراً اسرائیل کی وزیر اعظم "گولڈہ مائیر" کے پاس لے جایا گیا۔ گولڈہ مائیر نے ایک گھریلو عورت کی مانند سینیٹر کا استقبال کیا اور اسے اپنے کچن میں لے گئی۔ یہاں اس نے امریکی سینیٹر کو ایک چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بٹھا کر چولہے پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا اور خود بھی وہیں آ بیٹھی۔ اس کے ساتھ اس نے طیاروں، میزائلوں اور توپوں کا سودا شروع کر دیا۔ ابھی بھاؤ تاؤ جاری تھا کہ اسے چائے پکنے کی خوشبو آئی۔ وہ اٹھی اور چائے دو پیالیوں میں انڈیلی۔ ایک سینیٹر کے سامنے رکھی اور دوسری گیٹ پر کھڑے امریکی گارڈ کو تھما دی۔ پھر میز پر آ بیٹھی اور امریکی سینیٹر سے محو کلام ہو گئی۔ چند لمحوں کی گفت و شنید اور بھاؤ تاؤ کے بعد شرائط طے پا گئیں۔ وہ اٹھی، پیالیاں سمیٹیں اور انہیں دھو کر واپس سینیٹر کی طرف پلٹی اور بولی "مجھے یہ سودا منظور ہے۔ آپ تحریری معاہدے کے لئے اپنا سیکرٹری میرے سیکرٹری کے پاس بھجوا دیجئے۔ اسرائیل اس وقت اقتصادی بحران کا شکار تھا، مگر گولڈہ مائیر نے کتنی سادگی سے اسرائیل کی تاریخ میں اسلحے کی خریداری کا اتنا بڑا سودا کر ڈالا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود اسرائیلی کابینہ نے اس بھاری سودے کو رد کر دیا۔ اسکا موقف تھا، اس خریداری کے بعد اسرائیلی قوم کو برسوں تک دن میں ایک وقت کھانے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ گولڈہ مائیر نے کہا: "آپ کا خدشہ درست ہے، لیکن اگر ہم یہ جنگ جیت گئے اور عربوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا تو تاریخ ہمیں فاتح قرار دے گی اور وہ بھول جائے گی کہ جنگ کے دوران فاتح قوم نے کتنے انڈے کھائے تھے اور روزانہ کتنی بار کھانا کھایا تھا۔ اسکے دسترخوان پر شہد، مکھن، جیم تھا یا نہیں اور ان کے جوتوں میں کتنے سوراخ تھے یا ان کی تلواروں کے نیام پھٹے پرانے تھے۔ فاتح صرف فاتح ہوتا ہے۔" گولڈہ مائیر کی دلیل پر اسرائیلی کابینہ کو اس سودے کی منظوری دینا پڑی۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ گولڈہ مائیر کا اقدام درست تھا اور پھر اسی اسلحے اور جہازوں سے یہودی عربوں کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ جنگ کے ایک عرصہ بعد واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے نے گولڈہ مائیر کا انٹرویو لیا اور سوال کیا: "امریکی اسلحہ خریدنے کے لئے آپ کے ذہن میں جو دلیل تھی، وہ فوراً آپ کے ذہن میں آئی تھی، یا پہلے سے حکمت عملی تیار کر رکھی تھی؟" چونکا دینے والا جواب تھا"۔ وہ بولی "میں نے یہ استدلال اپنے دشمنوں (مسلمانوں) کے نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے لیا تھا۔" مذاہب کا موازنہ میرا پسندیدہ موضوع تھا۔ انہی دنوں میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات پڑھی۔ اس کتاب میں مصنف نے ایک جگہ لکھا تھا کہ۔۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو ان کے گھر میں اتنی رقم نہیں تھی کہ چراغ جلانے کے لئے تیل خریدا جا سکے، لہٰذا ان کی اہلیہ (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) نے ان کی زرہ بکتر رہن رکھ کر تیل خریدا، لیکن اس وقت بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کی دیواروں پر تلواریں لٹک رہی تھیں۔ یہ واقعہ پڑھا تو میں نے سوچا کہ دنیا میں کتنے لوگ ہوں گے جو مسلمانوں کی پہلی ریاست کی کمزور اقتصادی حالت کے بارے میں جانتے ہوں گے لیکن مسلمان آدھی دنیا کے فاتح ہیں، یہ بات پوری دنیا جانتی ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اگر مجھے اور میری قوم کو برسوں بھوکا رہنا پڑے، پختہ مکانوں کی بجائے خیموں میں زندگی بسر کرنا پڑے، تو بھی اسلحہ خریدیں گے، خود کو مضبوط ثابت کریں گے اور فاتح کا اعزاز پائیں گے۔" گولڈہ مائیر نے انٹرویو نگار سے درخواست کی اسے "آف دی ریکارڈ" رکھا جائے اور شائع نہ کیا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے نبی ﷺ کا نام لینے سے جہاں اس کی قوم اس کے خلاف ہو سکتی ہے، وہاں دنیا میں مسلمانوں کے موقف کو تقویت ملے گی۔ چنانچہ واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے نے یہ واقعہ حذف کر دیا۔ جب گولڈہ مائیر انتقال کر گئی اور وہ انٹرویو نگار بھی صحافت سے الگ ہو گیا۔ تب ایک اور نامہ نگار، امریکہ کے بیس بڑے نامہ نگاروں کے انٹرویو لینے میں مصروف تھا۔ اس سلسلے میں وہ اسی نامہ نگار کا انٹرویو لینے لگا جس نے واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے کی حیثیت سے گولڈہ مائیر کا انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو میں اس نے گولڈہ مائیر کا واقعہ بیان کر دیا، جو سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تھا۔ اس نے کہا کہ "میں نے جب تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا، تو میں عرب بدوؤں کی جنگی حکمت عملیاں دیکھ کر حیران رہ گیا، کیونکہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ طارق بن زیاد جس نے جبرالٹر کے راستے اسپین فتح کیا تھا، اس کی فوج کے آدھے سے زیادہ مجاہدوں کے پاس پورا لباس نہیں تھا۔ وہ بہتر بہتر گھنٹے ایک چھاگل پانی اور سوکھی روٹی کے چند ٹکڑوں پر گزارا کرتے تھے"! یہ وہ موقع تھا، جب گولڈہ مائیر کا انٹرویو نگار قائل ہو گیا کہ۔۔ تاریخ فتوحات گنتی ہے، دسترخوان پر پڑے انڈے، جیم اور مکھن نہیں۔ یہ انٹرویو کتابی شکل میں شائع ہوا تو دنیا اس ساری داستان سے آگاہ ہوئی۔ یہ واقعہ مسلمانان عالم کو جھنجھوڑ رہا ہے، سمجھا رہا ہے کہ ادھڑی عباؤں اور پھٹے جوتوں والے گلہ بان، چودہ سو برس قبل کس طرح جہاں بان بن گئے۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک یہودی عورت نے تو سبق حاصل کر لیا۔ مگر مسلمان اس پہلو سے نا آشنا رہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی، علوم و فنون پر دسترس رکھنے کی بجائے لاحاصل بحثوں اور غیر ضروری کام میں مگن رہے۔ چنانچہ زوال ہمارا مقدر ٹھہرا۔۔۔۔ منقول

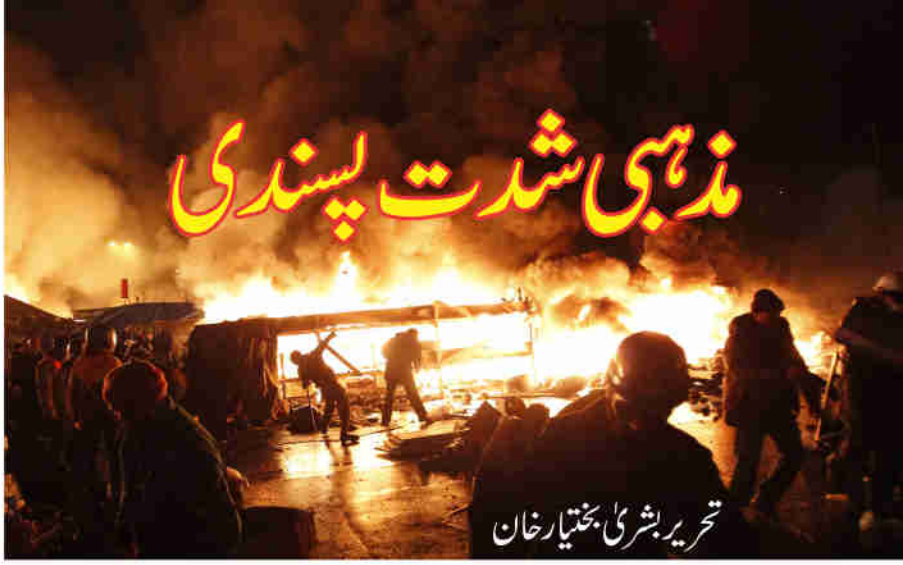

مذہبی شدت پسندی

تحریر بشریٰ بختیار خان

ہم دنیا میں صرف جینے نہیں آئے نہ ہی صرف امتحان دینے آئے بلکہ دنیا کو ایک ویران خطے سے جنت سے بھی بہتر زمین بنانے کے لیے بھیجے گئے لیکن اس بات کا ادراک کسی کو نہ ہوا اور شاید نہ ہو سکے گا، دنیا ایسی دنیا نہ تھی جیسی اب بن چکی ہے یا بنائی جا رہی ہے، اوائل میں دنیا ایک سخت پتھریلی مٹی کا ٹکڑا تھی جسے بہت ہی محنت اور لگن سے بسایا گیا اور اس پہ پھل پیڑ پودے لگائے گئے نہریں دریا جھیلیں اور جھرنے بچھائے گئے۔ انسان کو محبت اور انس کا پیکر سمجھ کر یہاں بھیجا گیا اور اس نے شروع میں محبت اور امن کا پرچار بھی کیا کہ اس زمین پہ پھولوں کی خوشبوؤں بسے لگیں حالات بہتر ہونے لگے پتھریلی مٹی زرخیز زمین میں بدلنے لگی خزائیں بہاروں میں تبدیل ہونے لگیں آسمان بادل برسانے لگا ماحول خوبصورت ہونے لگا اس زمین کو سرزمین بنانے میں انسان کا بہت اہم کردار رہا اور شاید رہے گا۔

وہ انسان جو محبت امن پیار اور الفت کا پیکر تھا اس نے آپس میں مقابلہ بازی شروع کی ایک کے پاس کچھ اچھا دیکھا تو اسے پہلے پانے کی حسرت کی اور پا نہ سکا یا اس جیسا کچھ حاصل نہ کر سکا تو اسے ہی چھین لینے میں خود کو مطمئن پایا اور ایسا کر بھی گزرا لیکن اس طرح لڑائی کا آغاز تو ہوا سو ہوا ایک بری روایت چل پڑی کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ وسائل اور آسائشوں کا زیادہ حق دار ہے وہ جو زیادہ طاقتور تھا وہ کمزور کو دبا کر رکھنے میں ہی لطف محسوس کرنے لگا اسے خود کو برتر ثابت کرنے کے لیے کمزور پہ ظلم کرنا اور اسے نیچا دکھانا اچھا لگنے لگا اور وہ اپنے لیے وہ سب کچھ کر گزرنے میں سکون محسوس کرنے لگا جس سے اُسے روکا گیا تھا یا باز رکھا گیا تھا پھر اس نے وہ کھیل کھیلنا شروع کیا جس کی خواہش شیطان کو تھی، اس نے ہر وہ کام کیا جس میں اُس کا مفاد تھا جس میں اُس کا فائدہ تھا وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی اپنے لیے سازگار بنانے کے لیے کبھی اپنے معاشرتی اقدار کو زیر کرتا تو کبھی اپنے رشتوں کو، اس نے صرف اور صرف جیتنے کی ٹھان رکھی تھی اور اس جیت نے انسانیت کو ہرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

انسان نے اپنے لیے جتنے فائدے لیے اور جتنے مواقع استعمال کیے جتنے داؤ پیچ کھیلے ان میں سب سے زیادہ خطرناک عقائد کا استعمال اور مذہب کا کاروبار رہا، انسان نے اپنے خدا بانٹے تو سب نے اپنے ان خداؤں سے صرف اپنے اپنے مطلب ہی نکلوائے، کسی نے خدا کو خدا نہ مانا نہ ہی دوست یا خالق مانا سب نے کاروبار کیا، کوئی ہندو عیسائی یہودی آتش پرست یا آج کل کا مسلمان صرف خدا کی رضا کو لے کر کہاں چلا اس نے اپنے علاوہ سب کا انکار کیا تا کہ اس کو سچا مانا جائے اس کا گروہ مظبوط ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ طاقت کا استعمال کر سکے اور زیادہ سے زیادہ دنیاوی فائدہ حاصل کر سکے وہ اپنے آپ کو بھی جانتا تھا اور دوسروں کو بھی لیکن صرف اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے باقی سب کو جھٹلانا ہی اس کی کاروباری بقا کی ضمانت تھی اور اس نے ایسا کرنے میں ہی عافیت جانی اور نتیجہ آج ہم سب کے سامنے ہے۔

اس وقت دنیا کا ماحول بڑی تیزی سے بدل رہا ہے مسلمان شدت پسند نہیں نہ ہی کوئی مذہب شدت پسندی کی تعلیم دیتا ہے، مختلف ناموں سے پکارنے پر خدا تبدیل نہیں ہوتا اس بات کا ادراک ہو جائے تو کوئی تفریق نہ رہے سب ایک خدا کو ماننے والے ہو جائیں تو نفرت شدت پسندی اور تعصب جیسی لعنتوں سے چھٹکارا مل جائے ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کے دشمن بن چکے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا گھر جلا کر ہمارے گھر میں روشنی دائمی رہے گی۔ اندھیرے کی آگ جنگل کی آگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اور ہم جہالت کے اندھیروں کو صدیوں سے کاشت کرتے آ رہے ہیں یہ اندھیرے دنیا کے ساتھ ساتھ ہمارے اخروی معاملات کو بھی برباد کر کے رکھ دیں گے اور پھر ہم اس مقام پہ جا پہنچیں گے جہاں سے آگے نہ کوئی سمت ہوگی اور نہ پیچھے کوئی راستہ۔

آج کل پاکستان اور پوری دنیا میں جس طرح ایک مذہب کے لوگ دوسروں کے لیے غصہ اور دشمنی کا عنصر رکھتے ہیں اور سوشل میڈیا پر جو واقعات نظر سے گزر رہے ہیں ان پہ دکھ اور افسوس کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے، یہودی ہندو مسلمان عیسائی سکھ سب کو چاہیے کہ اپنے اپنے عقائد اور مزہب کے ساتھ ساتھ دوسروں کے نظریات و ایمان کا احترام کرنا شروع کریں اور پھر جلد ہی دنیا ایک بار پھر امن اور محبت کا گہوارہ بن جائے گی۔

عبدالکریم قدسی

جس کی راہوں پر مسلط ہے تعصب کی ہوا
اے خدا! تو نے مجھے کس دور میں پیدا کیا
بھیک بھی ملتی نہیں اب تو خدا کے نام پر
ظرف کتنا گر گیا اس دَور کے انسان کا
زینۂ شہرت ہے یہ ہر شخص کی پگڑی اچھال
نیک کہلانا ہے تو ہر شخص پر تہمت لگا
باغباں نے اوڑھ لی جب سے ردا صیاد کی
اڑتے جاتے ہیں چمن سے طائرانِ خوشنوا
بادۂ آسودگی سے وہ کبھی ممکن نہ تھا
جو مزا مجھ کو مسائل کی خراشوں نے دیا
روز اونچی ہوتی جاتی ہے ضرورت کی فصیل
روز مجھ کو مل رہی ہے میری غربت کی سزا
مشرقی اقدار میں قدسیؔ سکونِ دل تو ہے
ہو سکے تو مغربی ماحول سے دامن بچا

فلاح شمس

دریا میں مثلِ قطرہ بہے جا رہا ہوں میں
ساغر کی کھوج میں ہوں چلے جا رہا ہوں میں
بے فکر ہو کے کس طرح انجامِ عشق سے
اُسکی ہر اِک ادا پہ۔ ہنسے جا رہا ہوں میں
ایسے گُناہ جن کو مکمل نہ کر سکا
اُن کی سزا بھی بھگتتے چلے جا رہا ہوں میں
رحمت پہ اُسکی مُجھ کو مکمل یقین ہے
پھر کیوں بہ خوفِ یزداں۔ ڈرے جا رہا ہوں میں؟
اس وادیٔ گُناہ میں یہ بھی تو ہے گُناہ
اَوروں کے جو گُناہ۔ گنے جا رہا ہوں میں
دُنیا کی لذّتوں کا۔ عبادت کا شوق بھی
دونوں کے درمیان۔ پسے جا رہا ہوں میں
میں شمس ناتواں ہوں اور ہوں ستم رسید
مُشکل ہے یا کہ سہل۔ جئے جا رہا ہوں میں

طاہر عارف کے ساتھ میری تازہ گفتگو

طاہر مجید

جاتے ہوئے تو کچھ بھی بتا کر نہیں گیا
کیوں اپنے دل کا حال سنا کر نہیں گیا
کیا بات تھی کہ تو نے کوئی بات ہی نہ کی
پھر کب ملیں گے یہ بھی بتا کر نہیں گیا
اب بیٹیوں کو نیند بھی آئے گی کس طرح
تو ان کو پیار سے جو سلا کر نہیں گیا
بچے تمہارے دیکھ کہ کتنے اداس ہیں
یوں تو کبھی تو ہاتھ چھڑا کر نہیں گیا
محفل کو زعفران بناتا تھا تو ہمیش
پھر آج کیا ہوا کہ ہنسا کر نہیں گیا
آخر جہاں گیا ہے تو طاہر کو چھوڑ کر
لیکن مجھے تو پھر بھی بھلا کر نہیں گیا

مرزا محمد افضل کینیڈا

جیون گزر گیا مگر نادانیوں کے بیچ
چلتے رہے یونہی مگر حیرانیوں کے بیچ
ہم کو نہیں ہے خوف کسی موجِ سیل کا
رکھا بلند حوصلہ طغیانیوں کے بیچ
خود کو قلندروں کی لڑی میں پرو لیا
پھر قربتیں ملیں انہیں قربانیوں کے بیچ
سود و زیاں کے پھیر سے نکلے تو یہ کُھلا
کھلتی ہے زندگی انہی تنہائیوں کے بیچ
اسکی عنایتوں نے کیا سرخرو مجھے
گزری ہے زندگی میری من مانیوں کے بیچ
مجھ کو بھی اس کے حسن تلطف سے ہے امید
میرا بھی نام ہو گا کہیں جانیوں کے بیچ

غزل

عشرت معین سیما

یہ تماشے ہیں ترے جگ کو دکھانے والے
ہم تری جادو گری میں نہیں آنے والے

اتنا دھوکا ہے وہاں جھوٹ کا بازار گرم
خیر ! ہم بھی ہیں یہاں سچ کو چھپانے والے

دلرباء ! چھیڑ ذرا سازِ محبت اپنا
ہم ہیں دنیا کو نئے راگ سنانے والے

چند لمحوں کی عنایت تھی سماعت مجھ کو
یہی لمحے تھے گلے شکوے مٹانے والے

دھوپ اور تیز ہواؤں نے گواہی دی ہے
پیڑ پر اب کے ثمر ہیں نہیں آنے والے

جائیے ! اپنی محبت بھی یہ لیتے جائیے
ہم کو مل جائیں گے اور ناز اُٹھانے والے

جہاں اپنوں نے کوئی روگ لگایا ہو وہاں
غیر سے کوئی دلاسے نہیں آنے والے

اب کے دیوالی پہ کچھ ایسی ہوا تیز ہوئی
بُجھ گئے سارے دیئے گھر کو سجانے والے

دل تک آیا ہے زمانے کی وہ راہ سے سیما
جب کے انداز نہ تھے اُس کے زمانے والے

بُشریٰ ناہید غزل

بہُت شوقین تھا مُجھ سے مِرا مدّاح ملنے کا
بہُت ہی شوق تھا اُسکو، مِرے اشعار پڑھنے کا

نجانے کب، کہاں سے، اُس میں ایسا جذبہ جاگا تھا
اُسے احساس بھی ہوتا نہیں تھا دِن گُزرنے کا

مِری تعریفوں کے پُل وہ باندھتا رہتا تھا باتوں میں
مُجھے وہ وقت بھی دیتا نہ تھا سجنے سنورنے کا

مِرے ہر شعر پہ واہ واہ کی ایسی رَٹ لگاتا تھا
کہ موقعہ ہی نہیں دیتا تھا وہ مُجھکو سنبھلنے کا

وہ اِک دِن بولا دے کے دعوت نامہ اِک مُشاعرے کا
اب آؤ وقت آیا ہے ہَوا کا رُخ بدلنے کا

لِکھو ایسی غزل اِک خوبصورت داد مِل جائے
تُمہیں موقعہ مِلے گا، اِن اندھیروں سے نِکلنے کا

غزل میری سُنی تو ہر طرف سے داد ہی آئی
غزل مشکُور تھی اُسکی، دِیا موقعہ اُبھرنے کا

ناروے کی ایک مسجد پر حملہ کے واقعہ پر لکھی گئی نظم

طاہرہ زرتشت

عزم جس کا بُرا تھا ارادہ بُرا
لے کے بارود مسجد میں داخل ہوا
مردِ مومن تھا کوئی جو چوکس کھڑا
اس کی نیت کو جان اس نے فوراً لیا
ہاتھ میں کوئی پسٹل نہ ہتھیار تھا
اک توکل خدا پر تھا ایمان تھا
شیر کی طرح دشمن پہ لپکا تھا وہ
ایک ہی جست میں اس کو قابو کیا
جب کہ ہونے کو تھا اک بڑا حادثہ
اس نے جرأت سے سب کو لیا تھا بچا

ہم میں ایماں کی طاقت جو باقی رہے
کوئی انساں نہ موذی درندہ بنے
ہر کوئی فرد گر یونہی چوکس رہے
سرحدوں کی حفاظت بھی ہوتی رہے
ہو کلیسا ، یا مسجد ہو مندر کوئی
اس کی عزت ، حفاظت ہمیشہ رہے
جاں کی حُرمت مقدّم رہے گی جسے
اس کی تعظیم پھر ناز ! کیوں نہ کرے

ڈاکٹر روتھ فاو

جرمنی میں ڈاکٹر روتھ فاو کی یاد میں تقریب

شمیم خان۔صدر بزم خواتین۔اردو جرمن کلچرل سوسائٹی فرینکفرٹ: Betreff

پاکستان میں مدر ٹریسا کا درجہ حاصل کرنے والی جرمن نژاد خاتون ڈاکٹر روتھ فاو کو انتقال کئے دو سال گزر گئے لیکن ان کا قائم کردہ مشن اب بھی پاکستان میں جاری ہے نہ تو پاکستانی Dr Ruth Pfau کو بھلا سکتے ہیں اور نہ ہی کبھی جرمنی میں ان کی خدمات اور ان کی شخصیت کو فراموش کیا جائے گا۔ڈاکٹر روتھ فاو 9 ستمبر 1929 کو جرمنی کے شہر لائپزگ Leipzig میں پیدا ہوئیں اور دس اگست 2017 کو ان کی وفات کراچی میں ہوئی۔ان کی خواہش کے مطابق ان کو کراچی میں ہی دفن کیا گیا۔حکومت پاکستان نے ان کو پورے اعزاز کے ساتھ دفن کیا اور اس روز پاکستان کا قومی پرچم سرنگوں رکھا گیا۔

جرمنی میں ان کے نام پر ادارہ روتھ فاو فاونڈیشن کے نام سے قائم ہے جو گائے با گائے ان کی یاد میں تقاریب منعقد کر کے اپنے عوام کو روتھ فاو جاری مشن کی تفاصیل سے آگاہ رکھتا ہے۔ روتھ فاو کی پیدائش پر نوے سال گزرنے کے حوالے سے ان کو یاد کرنے کی خاطر ماہ ستمبر میں جرمنی میں دو تقاریب منعقد ہوئیں ۔پہلی تقریب 3 ستمبر کو Würzburg شہر میں اور دوسری 19 ستمبر کو Münster شہر میں German Leprosy and Tuberculosis Relief Association اور Roth Pfau Foundation کے باہمی تعاون سے منعقد ہوئیں۔جن میں تقاریر کے علاوہ ایک بڑی اہم فلم بھی حاضرین کو دکھائی گئی کہ روتھ فاو کی وفات کے دو سال بعد بھی ان کے پاکستان میں قائم ادارے کس طرح کام کر رہے ہیں۔روتھ فاو کا وہ سادہ رہائشی کمرہ بھی دکھایا گیا جس میں سادگی سے رہ کر اس نے خدمت انسانیت کا فریضہ سرانجام دیا۔ پاکستان میں روتھ فاو کے ساتھ تیس سال کام کرنے کی سعادت حاصل کرنے اور اب ان کے مشن کو جاری رکھنے کے نگران Mr.Merviyn Lobo بطور خاص پاکستان سے تشریف لائے تھے۔بزم خواتین اردو جرمن کلچرل سوسائٹی کا نمائندہ وفد بھی ان تقاریب میں شامل ہوا۔

ڈاکٹر روتھ فاو نے اپنی میڈیکل تعلیم 1950 میں مکمل کرنے کے بعد اپنے بچپن میں دیکھے ہوئے حالات کے زیر اثر سماجی تنظیم ڈی ایچ ائم ofDoughter the heart Marry کی رکنیت اختیار کر کے ان کے تحت میڈیکل خدمات سرانجام دینا شروع کیں۔1960 میں ان کا تبادلہ کلکتہ کر دیا گیا۔دوران سفر ان کا جہاز کراچی میں خراب ہو گیا اور ان کو ایک رات کراچی میں رُکنا پڑا۔اسی رات تقدیر نے ان سے وہ اہم فیصلہ کروایا کہ روتھ فاو نے کراچی کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔اور پھر اپنی زندگی کے 57 سال کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں خدمت انسانیت میں مصروف رہ کر گزارے۔آپ نے جزام اور کوڑھ کے مریضوں کا علاج شروع کیا۔جس کے لئے انہوں نے جرمن اداروں سے رابطے کئے۔ چنانچہ German Leprosy and Tuberculosis Relief Association نے اپ کا ہاتھ پکڑا اور آج تک یہ ادارہ پاکستان میں خدمت انسانیت کے منصوبوں میں مدد فراہم کر رہا ہے۔اس ادارے کے ساتھ مل کر روتھ فاو نے 1962 میں پہلا جذام کے علاج کا مرکز کراچی میں قائم کیا۔1963 میں 80 بستروں پر مشتمل لیپروسی سینٹر قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور جلد ہی اس کے ساتھ نیشنل ٹریننگ سنٹر بھی قائم کر دیا۔ 1966 میں اپ نے کراچی سے باہر کام کی ابتدا کی اور خدمت انسانیت کے نیک کام کو سندھ، پنجاب، خیبر پختونخواہ، بلوچستان، آزاد کشمیر اور پھر فاٹا تک پھیلایا۔ پاکستان سے آے مہمان

مسٹر Lobo نے بتایا کہ جب فاٹا دہشت گردوں کے قبضہ میں تھا تب بھی روتھ فاو وہاں جاتی رہیں اور وہاں کے لوگ ان کے ساتھ عزت سے پیش آتے تھے۔ وہ خطرات میں گھرے زمانے میں بھی بسوں میں سفر کرتیں۔ان کا یہ فارمولہ تھا کہ اگر میں نے کار رکھی تو دوسرے سٹاف کو بھی کار کی خواہش پیدا ہو گی اور لوگ ہمیں چندہ مریضوں کے علاج کے لئے دیتے ہیں۔علاج کے نام پر مانگی رقم علاج پر ہی خرچ ہونی چاہیے۔1983 میں انہوں نے جذام کے علاج کے لئے

جدید طریقے ملٹی ڈرگ پالیسی کو پاکستان میں متعارف کروایا۔ 1993 میں خیبر پختونخواہ میں جذام اور کوڑھ کے ساتھ ساتھ امراض چشم کے علاج کی ابتدا کی۔ آپ کی کوششوں کے نتیجہ میں اقوام متحدہ نے 1996 میں پاکستان کو جذام فری ملک قرار دے دیا۔ انسانیت کی بے لوث خدمت کے اعتراف میں آپ کو جرمنی، اسٹریا، فلپائن و دیگر ملکوں نے اعزازات سے نوازا۔ حکومت پاکستان کی طرف سے بھی روتھ فاو کو نشان قائداعظم، ہلال امتیاز، ہلال پاکستان دئے گئے، لیکن ان کے لئے سب سے بڑا اعزاز پاکستان کے عوام کی محبت تھی۔ جب وہ 65 سال کی عمر کو پہنچیں تو ایک صبح انہوں نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ جرمن قانون کے مطابق اب میں ریٹائر ہو رہی ہوں اور اب مجھے اپنے وطن واپس لوٹنا ہے۔ یہ بات سٹاف اور مریضوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔ چنانچہ سب ان کے کمرے کے آگے جمع ہو گئے اور روتھ فاو کو سمجھانے لگے کہ بیٹے اور بیٹیاں شادی کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں لیکن ماں وہ گھر کبھی نہیں چھوڑتی۔ آپ ہماری ماں ہیں۔ ہم آتے جاتے رہیں گے لیکن اپ نے اس گھر میں ہی رہنا ہے۔ بقول Dr Lobo

اس روز روتھ فاو نے اپنا پیک شدہ سامان کھول دیا اور ہمیشہ کے لئے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا اور وصیت کی کہ مجھے پاکستان کی سرزمین میں دفن کیا جائے۔

اپنے 57 سالہ خدمت انسانیت کے پاکستانی دور کے دوران انہوں نے کراچی میں 11، اندرون سندھ 14، پنجاب 19، فاٹا پختون خواہ 36، بلوچستان 16، گلگت بلتستان 16 اور آزاد کشمیر میں 50 سنٹر قائم کئے جہاں جذام، کوڑھ اور ٹی بی کا مفت علاج کیا جا رہا ہے۔ اب روتھ فاو گورا قبرستان کراچی میں ابدی نیند سو رہی ہیں لیکن ان کا نام اور کام ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ان کی قبر کو دنیا کی پہلی ڈیجیٹل قبر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے ڈاکٹر روتھ فاو کی قبر کے ماربل پر کیو آر کوڈ کنندہ کیا گیا ہے۔ جسے کسی بھی اسمارٹ فون پر اسکین کرنے سے موبائل صارف روتھ فاو کی زندگی اور خدمات سے متعلق بنائے گئے خصوصی گوگل دستاویزات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کیو آر کوڈ کی تصویر کو اسکین کر کے بھی ڈاکٹر روتھ فاو کے متعلق دستاویزات تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

آغا خان کے ساتھ چھٹیاں گزارنے پر جسٹن ٹرُوڈو سے تحقیقات

کینیڈا کے وزیر اعظم جسٹن ٹرُوڈو کو ارب پتی اور روحانی رہنما آغا خان کے ذاتی رہائش گاہ پر چھٹی گزارنے پر تحقیقات کا سامنا ہے۔ جسٹن ٹرُوڈو اور ان کی فیملی سال نو پر بہاماس میں آغا خان کی رہائش گاہ پر مہمان تھے۔ اب فیڈرل ایتھکس کمشنر اس بات کا جائزہ لیں گے کیا اس دورہ کی وجہ سے قوانین کی خلاف ورزی تو نہیں کی گئی۔ وزیر اعظم جسٹن ٹرُوڈو نے اس حوالے سے کہا کہ وہ کسی بھی قسم کے 'سوالات کے جوابات دینے پر خوش ہیں'۔

گذشتہ ہفتے ابتدائی انکوائری کے بعد ایتھکس کمشنر میری ڈاسن نے کہا تھا کہ وہ باقاعدہ طور پر اس بات کی تحقیقات کریں گی کہ کیا مسٹر ٹرُوڈو نے اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ جب جسٹن ٹروڈو کی چھٹی کے بارے میں خبریں منظرِ عام پر آئیں تو انھوں نے اپنی ان چھٹیوں کی تمام معلومات فراہم کرنا شروع کر دیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس دوران انھوں نے آغا خان کا ذاتی ہیلی کاپٹر بھی استعمال کیا۔

جمعے کے روز ایک پریس کانفرنس میں جسٹن ٹروڈو نے کہا کہ 'سال نو پر وہاں رہائش اختیار کرنا ان کی ذاتی چھٹیوں کے سلسلے میں تھا'۔ ان کے اس دورے پر ان کے ساتھ لبرل پارٹی کے رکن پارلیمان سیمس اوریگن اور لبرل جماعت کی صدر اینا گینی اور ان کے شراکتدار بھی موجود تھے۔ خیال رہے کہ پرنس کریم آغا خان کینیڈین وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو کے قریبی خاندانی دوست ہیں۔

آغا خان فاؤنڈیشن بااثر فاؤنڈیشن کے طور پر رجسٹرڈ ہے اور گذشتہ کئی دہائیوں سے لبرل اور کنزرویٹو جماعتوں کی وفاقی حکومتوں سے لاکھوں ڈالر حاصل کرتی رہی ہے۔ واضح رہے کہ پرنس کریم آغا خان اسماعیلی مسلمانوں کے 49ویں امام ہیں اور انھیں پیغمبر اسلام محمد ﷺ کی نسل سے بتایا جاتا ہے۔

پرنس کریم آغا خان سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوئے اور فرانس میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے پاس برطانوی پاسپورٹ ہے اور انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ فوربز میگزین کے مطابق پرنس کریم آغا خان دنیا کے 15 امیر ترین شاہی افراد میں سے ایک ہیں۔ ان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق 2008 میں ان کے پاس ایک ارب ڈالر کی دولت موجود تھی۔

زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا عالمگیر رواج اور اسکے فوائد

تحریر ڈاکٹر نعیم طاہر سون (ہومیو)

زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے فوائد

دور جدید میں کھانا کھانے کیلئے کرسی میز کا رواج عام ہوگیا ہے اور ہمارا روایتی طریقہ جس میں چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا تھا اب تقریباً ختم ہوتا جارہا ہے۔ مغربی سائنسدانوں نے ایک حالیہ تحقیق میں ثابت کیا ہے کہ کرسی میز کی بجائے زمین پر چٹائی وغیرہ بچھا کر کھانا کھانے سے صحت کیلئے بے پناہ فوائد حاصل ہوتے ہیں، اگرچہ ان فوائد کی فہرست بہت طویل ہے مگر چند ایک درج ذیل ہیں زمین پر بیٹھ کر کھانے سے کھانا بہتر طور پر ہضم ہوتا ہے کیونکہ زمین پر بیٹھنے سے جسم زیادہ آرام دہ حالت میں ہوتا ہے۔ زمین پر بیٹھ کر کھانے سے جلدی پیٹ بھرنے کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے موٹاپے کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ نیچے بیٹھ کر کھانے سے کمر، جانگھ اور ٹانگوں کے عضلات میں لچک پیدا ہوتی ہے اور دردوں سے نجات ملتی ہے۔ گھٹنوں کے جوڑوں میں درد نہیں ہوتی اور سوجن سے محفوظ رہتے ہیں۔ ذہن اور نروس سسٹم آرام دہ حالت میں رہتے ہیں اور ہائی بلڈ پریشر کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ دل اور اسکے عضلات خون کی بہتر فراہمی اور روانی کی وجہ سے مضبوط ہوتے ہیں اور ہارٹ اٹیک کا خطرہ کم ہوتا ہے۔

زمین پر بیٹھ کر کھانے سے آپ اپنے کھانے کے عمل پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور غذا بہتر طور پر جزوِ بدن بنتی ہے۔ معدہ خراب نہیں ہوتا معدہ میں گیس کم پیدا ہوتی ہے۔ اکٹھے بیٹھ کر کھانے کا مقصد بھی زمین پر بیٹھنے سے بہتر طور پر پورا ہوتا ہے کیونکہ سارا گھرانہ ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ سکتا ہے۔ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے سے آپ کے کمر اور کندھوں کے عضلات صحت مند رہتے ہیں جس کی وجہ سے آپ چلتے ہوئے اور بیٹھے ہوئے کمر اور کندھے سیدھے رکھتے ہیں۔

(خلاصہ مضمون از www.thehealthsite.com/why)

یورپین جرنل آف پرہونیٹو کارڈیالوجی" میں شائع ہونے والی تحقیق کے مطابق زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے والے لوگ زیادہ لمبی زندگی پاتے ہیں۔ اس طریقہ سے ٹانگوں اور کولہوں کے جوڑ خشکی اور کھنچاؤ سے محفوظ رہتے ہیں۔

زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے سے دل کی صحت بہتر ہوتی ہے اور دوران خون بھی بہتر ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں دل کی بیماریوں، خصوصاً ہارٹ اٹیک کا خدشہ بہت کم ہوجاتا ہے۔

(خلاصہ مضمون از www.thehealthsite.com/why)

آنحضرت ﷺ کے کھانا کھانے کا طریق۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر دسترخوان بچھا کر کھاتے تھے، ٹیبل پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں کھایا اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ میز کرسی پر کھانا انگریزوں کی "سنت" ہے، مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی نقالی نہیں کرنی چاہئے۔

اصحاب رسول ﷺ کا زمین پر بیٹھ کر کھانا پینا

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا ہے، ان کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ایک موقع پر کئی دن کے فاقے سے بھوک کی شدت سے بے تاب تھے۔ لمبی روایت ہے۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ حالت دیکھی تو گھر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوہریرۃؓ ساتھ تھے۔ وہاں گھر میں گئے۔ ایک دودھ کا پیالہ کہیں سے تحفہ آیا ہوا تھا، تو آپؐ نے حضرت ابوہریرۃ کو فرمایا کہ جاؤ جتنے بھی اصحابِ صفہ بیٹھے ہیں اُن سب کو بلا لاؤ۔ ان کی بھوک سے بُری حالت تھی۔ کہتے ہیں مَیں گیا اور ایک دائرہ کی صورت میں سب زمین پر بیٹھ گئے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کہا کہ دائیں طرف سے ان کو یہ دودھ پلانا شروع کرو۔ یہ خود بیان فرماتے ہیں کہ میری بھوک کی ایسی حالت تھی کہ مَیں سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ پہلا حق میرا ہے۔ اور جس طرح میں دودھ دیتا جاتا تھا، ہر اگلے شخص کو دودھ دیتے ہوئے میرے دل کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ اب یہ ختم ہوجائے گا اور میں بھوکا رہ جاؤں گا۔ اتنی بے چینی تھی بھوک کی۔ لیکن بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیونکہ اس سے ایک دو گھونٹ لئے ہوئے تھے، برکت پڑی ہوئی تھی، دعا تھی، اس برکت سے اُن سب نے دودھ پی لیا۔ (صحیح بخاری کتاب الرقاق باب کیف کان عیش النبی ﷺ و اصحابہ و تخلیھم عن الدنیا حدیث 6452)

کھڑے ہوکر کھانا کھانا، اسی طرح میز کرسی پر بلاعذر کھانا دونوں خلافِ سنت ہیں،، مغرب کی اندھی تقلید میں لوگ ایسا کرنے لگے ہیں، جب کہ سنت کا طریقہ یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر فرشی دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا جائے، اللہ کے رسول صلی

اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی عادت مبارکہ یہی تھی عن أنس قال: ما أكل رسول الله ـصلى الله عليه وسلمـ في خوان ولا في سكرّجة ولا خُبزَ له مرقق، قال فقلت لقتادة: فعلامَ كانوا يأكلون؟ قال: على هذه السّفر (ترمذی، رقم: ۱۷۸۲، أبواب الأطعمة) یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (میز) ٹیبل پر نہیں کھایا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹی تشتری میں کھایا اور نہ آپ کے لیے چپاتی پکائی گئی، راوی نے حضرت "قتادہ" سے پوچھا: پھر دور نبوی میں لوگ کس چیز پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے؟ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: انہی چمڑے کے دسترخوانوں پر کھانا رکھ کر کھالیا کرتے تھے۔

احادیث میں اکڑوں بیٹھنے کی صراحت نہیں ملتی ہے البتہ یہ ملتا ہے کہ مسکینوں کی طرح بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھاتے تھے، دوزانو بیٹھ کر کھاتے یا ایک زانو ہو کر بیٹھتے۔ اور اگر کوئی موٹا آدمی ہے وہ دوزانو یا ایک زانو بیٹھ کر نہیں کھا سکتا ہے تو معذوری میں چہارزانو بیٹھ کر کھا سکتا ہے۔

آج کل ٹیبل کرسی پر اور الگ الگ پلیٹوں میں کھانے کا رواج عام ہے اور یوں کہا جاتا ہے کہ الگ الگ پلیٹوں میں کھانے سے کھانا ضائع اور برباد نہیں ہوتا، اور ایک ساتھ بڑے خوانچے میں یا بڑی پلیٹ میں کھانے سے جو کھانا بچتا ہے وہ ضائع ہو جاتا ہے حالانکہ زمین پر دسترخوان بچھا کر بیٹھ کر کھانا سنت ہے، ٹیبل کرسی پر کھانے کا طریقہ اسلامی طریق نہیں ہے۔ ایک ساتھ مل کر ایک برتن میں کھانا بھی مسنون اور باعث برکت ہے الگ الگ پلیٹوں میں کھانا اسلامی طریقہ نہیں ہے، یہ غیر قوم کا طریقہ ہے کہ وہ دعوتوں اور گھروں میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں مگر سب کی پلیٹیں الگ الگ ہوتی ہیں اگر مسلمان بھی یہی طریقہ اختیار کریں تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں امتیاز کی کیا صورت ہوگی؟ نیز یہ تو ہم پرستوں کا طریقہ ہے جو امراض کے متعدی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، حدیث میں ہے عن عمر بن الخطاب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلوا جمیعا ولا تفرقوا فان البرکۃ مع الجماعۃ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا سب ساتھ مل کر کھاؤ الگ الگ نہ کھاؤ۔ (فتاوی رحیمیہ جلد 10 صفحہ 142)

اسی طرح عمر بن ابو سلمہ سے روایت ہے کہ میں جب چھوٹا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں بیٹھا تھا (جبکہ آپ ﷺ زمین پر تشریف فرما تھے) ور میرا ہاتھ پوری تھالی میں گھوم رہا تھا، تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لڑکے! اللہ کا نام لو، اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور جو تمہارے سامنے ہے اس میں سے کھاؤ) (بخاری 3576 و مسلم 2022)

سیدہ ام منذر (سلمٰی) بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ میرے گھر تشریف لائے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ ابھی بیماری سے اٹھے تھے (جس کی وجہ سے ان میں کمزوری تھی) اور ہمارے پاس کھجور کے چند خوشے لٹکے رہے تھے پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر اس میں سے کھانا شروع کر دیا سیدنا علی بھی کھانے کے لیے کھڑے ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو کہنا شروع کیا کہ ٹھہر جاؤ تم ابھی بیماری سے اٹھے ہو، کمزور ہو، یہاں تک کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ رک گئے ام منذر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے جو اور انڈے بنائے تھے وہ لے آئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے علی (رضی اللہ عنہ) اس میں کھاؤ اس لیے کہ اس میں تمہارے لیے زیادہ فائدہ ہے۔

(سنن ابوداؤد: جلد سوم: حدیث نمبر 466 طب کا بیان)

کھانا کھاتے ہوئے یہ ادب کے خلاف ہے کہ انسان ٹیک لگائے اسکی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔ (بخاری: 5399)

چنانچہ ابن حجر کہتے ہیں: "ٹیک لگانے کی کیفیت میں اختلاف کیا گیا ہے، کچھ کہتے ہیں: کھانے کیلئے کسی بھی طرح سے زمین پر پسر جانا اس میں شامل ہے، اور کچھ کہتے ہیں کہ: کسی ایک طرف ٹیک لگا کر بیٹھنا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: بائیں ہاتھ کو زمین پر رکھ کر اس پر ٹیک لگا کر بیٹھنا۔۔۔، ابن عدی نے ضعیف سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے دوران بائیں ہاتھ پر ٹیک لگا کر بیٹھنے سے ڈانٹ پلائی ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ یہ ٹیک لگانے کی ایک شکل ہے، میں ابن حجر۔ کہتا ہوں کہ: امام مالک کی اس بات میں اشارہ موجود ہے کہ جو بھی شکل ٹیک لگانے میں شامل ہوگی وہ مکروہ ہے، چنانچہ اسکے لئے کوئی خاص کیفیت نہیں ہے" انتہی از "فتح الباری" (9/541)

اصحاب صفہ کی زمین پر رہائش اور کھانا پینا

صفہ کے معنی ہیں چبوترا (تھڑا) مسجد نبوی سے متصل پیچھے کی جانب تھوڑا سا چبوترا بنا دیا گیا تھا جہاں مہمان اترتے تھے اور علم سیکھنے والے فقراء صحابہ وہاں مستقل طور پر رہتے تھے۔

صحابہ کرام کا ایک گروہ جو محض عبادت الٰہی اور صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر مہاجرین مکہ تھے اور فقر و غنا کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ حضرات کم و بیش ہوتے رہتے تھے کبھی 70 اور کبھی 200 سے

زیادہ گویا یہ مدرسہ نبوی مسجد نبوی کے ایک کنارے پر ایک چبوترا تھا جس پر کھجور کی پتیوں سے چھت بنا دی گئی تھی۔ اسی چبوترا کا نام صفہ ہے جو صحابہ گھر بار نہیں رکھتے تھے وہ اسی چبوترا پر سوتے بیٹھتے اور ادھر ہی کھاتے پیتے تھے۔ اور یہی لوگ اصحاب صفہ کہلاتے ہیں۔

صحابہ کرام کا زمین پر بیٹھ کر کھجوریں کھانا

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہ بہن خندق کے پاس دو مٹھی کھجور لے کر آئیں کہ ان کے بھائی اور ماموں کھالیں گے لیکن رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزریں تو آپ ﷺ نے ان سے وہ کھجوریں لے لیں اور زمین پر ایک کپڑے کے اوپر بکھیر دیں۔ پھر اہلِ خندق کو دعوت دی۔ اہلِ خندق انہیں کھاتے گئے اور وہ بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ سارے اہلِ خندق کھا کھا کر چلے گئے اور کھجوریں تھیں کہ کپڑے کے کناروں سے باہر گر رہی تھیں۔ (ابنِ ہشام جلد 2 /صفحہ 218)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوت: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ فاقوں سے شکم اقدس پر پتھر بندھا ہوا دیکھ کر میرا دل بھر آیا چنانچہ میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اجازت لے کر اپنے گھر آیا اور بیوی سے کہا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس قدر شدید بھوک کی حالت میں دیکھا ہے کہ مجھ کو صبر کی تاب نہیں رہی کیا گھر میں کچھ کھانا ہے؟ بیوی نے کہا کہ گھر میں ایک صاع جو کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، میں نے کہا کہ تم جلدی سے اس جو کو پیس کر گوندھ لو اور اپنے گھر کا پلا ہوا ایک بکری کا بچہ میں نے ذبح کر کے اس کی بوٹیاں بنا دیں اور بیوی سے کہا کہ جلدی سے تم گوشت روٹی تیار کر لو میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بلا کر لاتا ہوں، چلتے وقت بیوی نے کہا کہ دیکھنا صرف حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور چند ہی اصحاب کو ساتھ میں لانا کھانا کم ہی ہے کہیں مجھے رسوا مت کر دینا۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خندق پر آ کر چپکے سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک صاع آٹے کی روٹیاں اور ایک بکری کے بچے کا گوشت میں نے گھر میں تیار کرایا ہے لہٰذا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صرف چند اشخاص کے ساتھ چل کر تناول فرمالیں، یہ سن کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے خندق والو! جابر نے دعوت طعام دی ہے لہٰذا سب لوگ ان کے گھر پر چل کر کھانا کھالیں پھر مجھ سے فرمایا کہ جب تک میں نہ آ جاؤں روٹی مت پکوانا، چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو گوندھے ہوئے آٹے میں اپنا لعاب دہن ڈال کر برکت کی دعا فرمائی اور گوشت کی ہانڈی میں بھی اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔ پھر روٹی پکانے کا حکم دیا اور یہ فرمایا کہ ہانڈی چولھے سے نہ اتاری جائے پھر روٹی پکنی شروع ہوئی اور ہانڈی میں سے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی نے گوشت نکال نکال کر دینا شروع کیا ایک ہزار آدمیوں نے آسودہ ہو کر کھانا کھالیا مگر گوندھا ہوا آٹا جتنا پہلے تھا اتنا ہی رہ گیا اور ہانڈی چولھے پر بدستور جوش مارتی رہی۔ (بخاری ج ۲ ص ۵۸۹ غزوہ خندق)

سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس ایک ہزار آدمی نے جس کو کھانا تک میسر نہ تھا زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا تھا یا کہ جدید فرنیچر پر؟

دنیا کی بہت سی اقوام میں زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا رواج ہے۔ اسکے فوائد کے باعث مذہبی تقریبات میں اور عبادت کے دوران کھانے زمین پر پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ کوریا، جاپان، افریقہ اور تمام اسلامی ممالک میں حتیٰ کہ خاص کعبہ میں ماہ رمضان میں جو افطاریاں کرائی جاتی ہیں وہ سب زمین پر کپڑا بچھا کر کروائی جاتی ہیں۔ جس میں ہزاروں لوگ شامل ہوتے ہیں۔ جماعت احمدیہ کے پاکستان میں جتنے بھی سالانہ جلسے ہوئے ان میں عوام الناس سب زمین پر پرالی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور پرالی پر بستر ڈال کر زمین پر ہی سوتے تھے۔ آج بھی پٹھان اور افغان زمین پر قالین پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھاتے ہیں اور زمین پر ہی سوتے ہیں۔ ذیل میں چند مختلف اقوام کی زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی تصاویر ہیں جس سے یہ امر بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانا ہرگز باعث توہین نہیں نہ ہی آداب معاشرت کے خلاف ہے۔

سیرالیون میں سکول کے بچے دوران سکول زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے

انڈین مرد و زن مذہبی تقریب میں زمین پر بیٹھ کر کیلے کے پتوں پر کھانا کھاتے ہوئے

SAAMS FUNCTION HALL
Catering & Event Management

Services Available

- Catering Service
- Special Events
- Corporate Event
- Linen
- Crockery
- Cutlery
- Fresh Flowers
- Drinks
- Stages Decore
- Barbecue Hire

Enquire for a Booking

We Take reservations Everyday

We also provide live Barbecue Function services in your Garden or Our Garden please inquire for details

Catering to your requirments
Cell:07883 815195

Mob:07883 815195 (Khalid Mahmood)
Mob: 07506 952105 (Naeem Chatha)
6-12 London Road Morden London
SM4 5BQ
Tel: 020 8640 0700
Email: saamshalluk@gmail.com
www.saamshall.co.pk

Under New Management
Newly Refurbished function Hall

London View Chambers
... your barristers

Skilled in Capital Markets & Securities; proficient in Corporate Finance; expert in Banking regulation; specialist in Competition policy & legislation; experienced in Public Law judicial review challenges; professionally qualified as Barristers in England and Advocates in Pakistan–Welcome to London View champers.

Tel: 02071834797

e-mail: Clerks@londonviewchambers.co.uk